ناشتا لاؤ

بیگم جمشید، انسپکٹر جمشید اور بچوں کو ناشتا کرا چکی تھیں۔ اب وہ و فرزانہ اور سکول جانے کی تیاری کر رہے تھے جب کہ بیگم جمشید برتن دھونے میں مصروف تھیں۔ بچوں سے پہلے انسپکٹر جمشید تیار ہو گئے۔

"اچھا بھئی، میں چلا — جاتے وقت اپنی امی کو بتا دینا تاکہ وہ دروازہ بند کر لیں۔" انھوں نے کہا۔

"جی اچھا —" محمود بولا۔

ان کے جانے کے پندرہ منٹ بعد وہ بھی تیار ہو گئے۔

"امی کو بتا دو فرزانہ، ہم جا رہے ہیں۔ آ کر دروازہ بند کر لیں۔"

"اچھا —" فرزانہ نے کہا اور دوڑتی ہوئی باورچی خانے کی طرف گئی۔

"امی جان، ہم جا رہے ہیں، دروازہ بند کر لیں۔"

"اچھا بیٹی، تم لوگ جاؤ۔ میں ابھی بند کر لیتی ہوں۔" بیگم جمشید بولیں۔

اور وہ تینوں بھی چلے گئے۔ صرف ایک منٹ بعد وہ اٹھیں اور دروازے کی طرف بڑھیں۔ دروازے کی چٹخنی لگا کر وہ واپس مڑیں تو فرش پر کیچڑ میں بھرے ایک جوتے کا نشان نظر آیا۔ وہ دھک سے رہ گئیں۔ بھلا کیچڑ بھرے جوتے کے نشان کا ان کے صحن میں کیا کام — چند قدم آگے بڑھیں تو تیز

پڑا نہیں ایک پستول رکھا نظر آیا۔ ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ دل دھک دھک
کرنے لگا۔ آنکھوں میں خوف سمٹ آیا — پھر جونہی انہوں نے نظریں اوپر اٹھائیں
ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کرسی پر کوئی موجود تھا۔

وہ بہت لمبا چوڑا اور خوفناک شکل صورت کا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں
اگرچہ چھوٹی تھیں مگر ان میں بلا کی چمک تھی، ہونٹ بھدے، سیاہ اور موٹے
تھے۔ سر کے بال گہرے سیاہ اور بہت گھنے تھے۔ ہاتھوں کی پشت اور بازوؤں
پر بھی بال ہی بال تھے — غرض پہلی نظر میں تو وہ خوفناک لگتا ہی تھا، غور سے
دیکھنے پر بھی اسے دیکھ کر بدن میں سنسنی سی پیدا ہونا لازمی بات تھی۔ خوف کی
ایک لہر بیگم جمشید نے اپنے جسم کے روئیں روئیں میں دوڑتی محسوس کی۔ ان کے
منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا — پھر اس کے کانوں سے اُس کی کرخت آواز
ٹکرائی — بالکل ایسی جیسی پھٹے ہوئے بانس میں سے نکلتی ہے:

"میں جانتا ہوں، گھر میں تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہے۔" یہ کہتے
وقت وہ مسکرایا بھی تھا — اس کی مسکراہٹ کس قدر خوفناک تھی۔ وہ کانپ
کر رہ گئیں، حلق خشک ہونے لگا۔ بدن میں تھرتھراہٹ دوڑنے لگی۔ آخر
بڑی مشکل سے انہوں نے اپنے لب کھولے:

"تم ...... تم کیا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے ناشتا۔" وہ ہنسا۔

"اگر تم بھوکے ہو تو تمہیں کھانا ضرور ملے گا — اس گھر سے کوئی بھوکا خالی
نہیں جاتا۔"

"میں بھوکا ضرور ہوں لیکن بھیک نہیں مانگتا۔ اس وقت چونکہ اس گھر پر
میری حکومت ہے، اس لیے جو حکم بھی دوں، تمہیں بجا لانا ہو گا۔ میں انکار سننے
کا عادی نہیں ہوں — جاؤ، پہلے میرے لیے ناشتا لے کر آؤ۔" اس نے گرجدار
آواز میں کہا۔

"اس گھر میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والا محفوظ نہیں رہ سکتا، تم
نے اپنی شامت کو آواز دی ہے۔"

اس کے الفاظ سن کر بیگم جمشید کو غصہ آ گیا — ان کا خوف اڑن چھو ہو گیا۔
وہ ایک دم دلیر ہو گئیں اور خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگیں، لیکن اس تبدیلی
سے بھی اس خوفناک آدمی نے کوئی اثر نہیں لیا۔

"میں جانتا ہوں، یہ انسپکٹر جمشید کا گھر ہے، یہاں اس کے تین بچے محمود،
فاروق اور فرزانہ بھی رہتے ہیں۔ ان کی بیوی بھی رہتی ہے — لیکن میں یہ بھی
جانتا ہوں کہ انسپکٹر جمشید دفتر جا چکے ہیں۔ بچے سکول جا چکے ہیں۔ اس کے
ساتھ ہی مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بچے دو بجے سے پہلے اور انسپکٹر جمشید پانچ
بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے — گھر کا دروازہ بند ہے اور اس گھر کا
کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ نہ ہی گھر میں ٹیلی فون ہے — پھر تم کس بنا پر
اس قدر اکڑ کر بات کر رہی ہو — یاد رکھو، میں بہت برا آدمی ہوں۔" اس
نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"وہ تو تم شکل سے نظر آ ہی رہے ہو۔" بیگم جمشید جل کر بولیں۔

"چلو اچھا ہے، تمہیں اندازہ ہو گیا ہے۔ اب جلدی سے ناشتا لے آؤ۔"

وہ پھر مسکرایا۔

"ناشتا ختم ہو چکا ہے۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"تو اور تیار کر لاؤ۔" اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے اپنے گھر میں بیٹھا ہو۔

"پہلے یہ بتاؤ، تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"ناشتے سے پہلے ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"اچھی بات ہے، میں تمھارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔" تنگ آ کر انھوں نے کہا اور باورچی خانے میں چلی آئیں۔ ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا — وہ سوچ رہی تھیں، ایک خوفناک آدمی کے ساتھ وہ کس طرح پیش آئیں — نہ جانے یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے — ساتھ ساتھ وہ اس کے لیے ناشتا بھی تیار کر رہی تھیں — یوں وہ اس کے مقابلے میں ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ ان کے ساتھ باورچی خانے میں نہیں آیا تھا، بدستور صحن میں بیٹھا رہا تھا۔ باورچی خانے سے نکل کر اس کی نظروں سے بچ کر کسی دوسرے کمرے تک جانا ناممکن تھا، وہ ضرور دیکھ لیتا؛ ورنہ وہ سیدھی اپنے کمرے میں جاتیں اور انسپکٹر جمشید کا پستول اٹھا لاتیں۔ فائر کرنا تو انھیں آتا ہی تھا — لیکن اس صورت میں، کہ وہ صحن میں بیٹھا تھا، کسی اور کمرے میں جانا ناممکن تھا۔ وہ ہوشیار بیٹھا تھا اور برابر باورچی خانے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

انھوں نے باورچی خانے کا جائزہ لیا، جہاں لوہے کے چمچ تھے جنھیں وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی تھیں — لیکن ایک پستول کے مقابلے میں وہ کیا کام دیتے — آخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عقل سے کام لے کر اس کا

مقابلہ کریں گی۔

انھوں نے ناشتا تیار کر لیا — ناشتے کو ٹرے میں رکھ کر وہ باہر نکلیں۔ نہ جانے کیوں اب انھیں کیوں خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھیں۔ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے انھوں نے زندہ دلی سے کہا:

"ناشتا تیار ہے، کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

"بہت خوب، اب آئی ہو تم سیدھے راستے پر — میرا خیال ہے، تم نے پہلے ہی کافی کچھ تیار کر دیا ہے؛ بہرحال اگر ان چیزوں سے میرا پیٹ نہ بھرا تو ضرور بتا دوں گا۔"

"ضرور بتا دینا۔" انھوں نے مسکرا کر کہا — خوفناک آدمی نے انھیں چند لمحوں کے لیے حیران ہو کر دیکھا اور پھر ناشتے پر اس طرح ٹوٹ پڑا جیسے کئی دنوں سے ایک کھیل بھی اڑ کر اس کے منہ میں نہ گئی ہو — لیکن پہلے ہی لقمے پر اسے ابکائی آ گئی — ڈبل روٹی کے توسوں میں نمک اور مرچ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا اور وہ بہت بدذائقہ تھے۔ اس کی آنکھوں اور ناک سے بھی پانی بہنے لگا۔

"یہ ناشتا ہے؟" وہ حلق پھاڑ کر چلایا۔

"تو کیا نہیں ہے؟" بیگم جمشید نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ان ڈبل روٹی کے ٹکڑوں میں سوائے نمک اور مرچ کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اوہ — شاید مجھ سے غلطی ہو گئی۔" انھوں نے چونک کر کہا۔ "تم یہ انڈوں کا آملیٹ کھا لو — اگر یہ اچھا لگا تو اور بنا دوں گی۔"

"یہ بھی دیکھ لیتا ہوں — لیکن تم میرے غصے کو آواز دے رہی ہو۔" اس نے مڑ کر کہا۔

"نہیں تو، میں نے تو کسی کو بھی آواز نہیں دی — جب سے تم آئے ہو، تم سے ہی باتیں کر رہی ہوں۔" انہوں نے معصومانہ لہجے میں کہا اور انہیں فاروق کا خیال آ گیا — اس قسم کے جواب وہی دیا کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا، وہ تو مزے سے سکول میں بیٹھے پڑھ رہے ہوں گے اور میں یہاں ایک نئی مصیبت میں پھنس گئی ہوں — ایک ایسی مصیبت میں کہ کچھ پتے نہیں پڑ رہا ہے، کیا کروں، کیا نہ کروں۔ دوسری طرف اجنبی نے آملیٹ چمچ میں لے کر منہ میں ڈالا اور پھر منہ نیچے کر کے اخ تھو اخ تھو کرنے لگا — منہ صاف کرنے کے بعد اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور گرج کر بولا:

"تو یہ آملیٹ ہے؟"

"اور یہ کسٹرڈ بھی ہے۔" بیگم جمشید مسکرائیں — وہ اس میں بہت ساری پھٹکری ملا لائی تھیں جس کی وجہ سے آملیٹ کڑوا زہر ہو گیا تھا۔

"میں سمجھ گیا، اس میں بھی کچھ ملا ہو گا — کیا تم مہمانوں کو ایسا ہی ناشتا دیا کرتی ہو؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"جو مہمان تمہاری طرح میرے گھر میں داخل ہوں، انہیں اس سے بہتر ناشتا نہیں دے سکتی۔" بیگم جمشید نے بھی برا سا منہ بنا کر کہا۔

"لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم کہ جو مجھے اس قسم کا ناشتا دے، میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔" اس نے بھی مسکرا کر کہا — اب اس نے اپنے

غصے پر قابو پا لیا تھا۔

"معلوم ہو ہی جائے گا — آپ آ گئے ہو تو خود کو ظاہر کیے بغیر تو جاؤ گے نہیں — ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

یہ سوال انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ انہیں بھی تھوڑی بہت جاسوسی کرنی چاہیے — کیونکہ محمود، فاروق اور فرزانہ تو گھر میں ہیں نہیں کہ سارا معاملہ ان پر ڈال کر آپ باورچی خانے میں چلی جائیں۔

"کیوں، تم نے میرا نام کیوں پوچھا؟" اس نے چونک کر کہا۔

"بس یونہی — گھر میں آئے مہمان کا نام پوچھنا کوئی اخلاق سے گری ہوئی بات تو نہیں ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اور حد سے زیادہ بدذائقہ ناشتا پیش کرنا کیا اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں ہے؟" اس نے تنک کر کہا۔

"بداخلاقی کی ابتدا بھی تو تمہاری طرف سے شروع ہوئی ہے۔"

"اچھا جاؤ — دوسرا ناشتا تیار کر کے لاؤ، لیکن اس مرتبہ ناشتا خوش ذائقہ ہونا چاہیے، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

"پہلے ہی کب ہے؟" بیگم جمشید نے تلملا کر کہا۔

"تم ناشتا تیار کرنے کے لیے جاتی ہو یا نہیں؟" اس نے پھر کہا۔

"تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ یہاں کس لیے آئے ہو، کیا چاہتے ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میں کوئی تمہارا ملازم تو ہوں نہیں کہ تمہاری ہر بات کا جواب دینے پر

مجبور ہوں — جاؤ، ناشتا لاؤ۔"

"افسوس تمہیں اسی ناشتے سے پیٹ بھرنا ہوگا۔" بیگم جمشید بولیں۔

"کیا مطلب؟"

"باورچی خانے میں اب کچھ نہیں بچا۔"

"تم جھوٹ کہتی ہو۔" اس نے غرّا کر کہا۔

"چل کر دیکھ لو۔" یہ کہتے وقت وہ مسکرائیں۔

"چلو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں آگے پیچھے چلتے باورچی خانے میں آئے اور پھر وہ خوفناک آدمی چونک اٹھا۔ انڈے فرش پر گرا کر توڑ دیے گئے تھے۔ ڈبل روٹی پانی میں بھگو دی گئی تھی۔ مربّے اور چٹنی کے خالی جار بھی اجنبی کا منہ چڑا رہے تھے۔ آٹے کے ڈرم کا ڈھکنا الگ پڑا تھا۔ اجنبی نے اس میں جھانک کر دیکھا۔ آٹے میں پوٹاشیم پرمینگنیٹ (لال دوائی) ڈال دیا گیا تھا۔ چینی کے ڈبے میں نمک اور مرچ بھی شامل کیے جا چکے تھے۔ غرض ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے ناشتا یا ناشتے کی قسم کی کوئی چیز تیار کی جا سکتی۔

بیگم جمشید کی چیخ

"یہ تم نے کیا کیا؟" خوفناک آدمی حلق پھاڑ کر بولا۔ وہ انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ناشتے کا سارا سامان برباد کر دیا — اب مجھے سو دو سو روپے خرچ کرنے پڑیں گے۔" بیگم جمشید نے افسوس بھرے لہجے میں کہا — نہ جانے کیا بات تھی، اب انہیں اس سے ڈر نہیں لگ رہا تھا، حالانکہ وہ پہلے سے زیادہ غصّے میں تھا۔

"اب میں کیا کھاؤں گا، میں بہت بھوکا ہوں۔" وہ گلا پھاڑ کر بولا۔

"تمہیں اپنے گھر سے ناشتا کر کے آنا چاہیے تھا۔ کسی کے گھر بن بلائے جاؤ تو کھا پی کر جانا چاہیے۔"

"خاموش، تمہاری آواز مجھے زہر لگ رہی ہے۔" وہ چلا اٹھا۔

"میرا بھی یہی حال ہے — کانوں میں درد ہونے لگا ہے — تمہاری بھدّی آواز سن سن کر۔" بیگم جمشید نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا — خون پی جاؤں گا۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"کیا آدم خور ہو؟" بیگم جمشید نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"اچھا، تم یوں نہیں مانو گی" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور بیگم جمشید کے
مٹھی میں پکڑ کر ایک جھٹکا مارا — ان کے منہ سے تکلیف کی وجہ سے ایک
گھٹی سی چیخ نکل گئی۔

"بولو میرے لیے ناشتا تیار کرو گی یا نہیں"

"اگر تم کہو تو میں باورچی خانے میں موجود چیزوں سے ناشتا بنا دوں"
انہوں نے اب بھی ڈرے بغیر کہا — "ویسے اگر تم اندر آنے کے بعد شراف
ثبوت دیتے تو میں کبھی کا تمہیں ناشتا کرا چکی ہوتی — لیکن تم نے تو ابھی
نہیں بتایا کہ کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے ہو، چاہتے کیا ہو —
مزے کی بات یہ کہ میرے گھر کا فرش برباد کر دیا — کیا تم دیکھ کر نہیں چلتے

"کیا مطلب؟" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"تمہارا ایک جوتا کیچڑ میں بھرا ہوا ہے — اس سے میرے گھر کا فرش
گندا ہو گیا ہے۔ بھلا میں ایسے آدمی کو ناشتا دے سکتی ہوں" بیگم جمشید کا
بن گیا۔

"اگر ناشتا نہیں دو گی تو پچھتاؤ گی" اس نے سرد آواز میں کہا۔

"اچھا، پچھتا لوں گی" بیگم جمشید نے مایوسانہ لہجے میں کہا اور وہ جھ
اٹھا۔ اس نے ان کے بالوں کو ایک اور جھٹکا دیا — ان کے منہ سے پھر
نکلی۔

"میں کرتا ہوں تمہارا بندوبست — اس کمرے میں چلو جس میں تم سو
ہو"

"کیوں، وہاں کیا کام ہے — کیا چارپائیاں چرا کر لے جانا چاہتے ہو؟"
انہوں نے پوچھا۔

"بے وقوف عورت! میں چور نہیں ہوں"

"تو پھر کیا ہو؟" وہ ایک دم بولیں۔

"جانے سے پہلے تمہیں ضرور بتا کر جاؤں گا"

"کب جا رہے ہو تم؟" انہوں نے پوچھا۔

"فکر نہ کرو — دو چار دن یہاں نہیں ٹھہروں گا"

"مجھے تو تم کوئی مفرور مجرم معلوم ہوتے ہو — سچ کہو — تم جیل سے
فرار ہو کر آئے ہو نا"

"جیل — میں نے آج تک جیل کا منہ نہیں دیکھا — نہ جانے جیل
کیسی ہوتی ہے" اس نے پُر غرور لہجے میں کہا۔

"اگر کچھ دیر ٹھہرے رہے تو شاید ہم تمہیں دکھا دیں، جیل کیسی ہوتی ہے"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس گھر اور گھر کے رہنے والوں کے بارے میں
سب کچھ جانتا ہوں — اسی لیے تو تمہارے دروازہ بند کرنے سے پہلے میں
گھر کے اندر موجود تھا"

"وہ تو میں سمجھ چکی ہوں، محمود، فاروق اور فرزانہ کے جاتے ہی تم اندر
آ گئے ہو گے — جب میں باورچی خانے سے نکلی تو تم میز کے نیچے دبک گئے
ہو گے تاکہ میں دروازہ بند کر دوں"

"ہوں، یہی بات ہے، لیکن تمہیں اس سے کوئی فائدہ تو پہنچنے سے

رہا — میں نے تم سے کہا تھا کہ چارپائیوں والے کمرے میں چلو۔"

"چلو۔" بیگم جمشید نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

وہ انہیں لے کر سونے والے کمرے میں آئیں۔ ان کے بال ابھی تک اس کی مٹھی میں تھے — بال اسی طرح پکڑے پکڑے اس نے اپنی جیب میں سے چاقو نکالا اور ایک چارپائی کی رسی کاٹ کر اسے چارپائی سے الگ کرنے لگا۔

"کیا مجھے باندھنے کا ارادہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں، تمہیں باندھ کر اطمینان سے اپنا کام کروں گا۔"

"یعنی ناشتا تیار کرو گے؟" بیگم جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اگر کچھ ملا تو ناشتا بھی تیار کروں گا؛ ورنہ باہر سے کچھ لے آؤں گا۔ میں بھوکا ننگا نہیں ہوں۔"

"وہ تو شکل سے ہی نظر آتے ہو۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک اچانک جھٹکا اپنے بالوں کو مارا۔ خوف ناک آدمی بے دھیان تھا۔ بال اس کے ہاتھ میں سے پھسل گئے۔ جھٹکے کے ساتھ ہی بیگم جمشید سرہانے والی میز تک پہنچ گئیں — دوسرے ہی لمحے وہ ایک دراز کھینچ کر اس میں سے پستول نکال چکی تھیں۔

"تم جانتے ہو کہ یہ گھر کس کا ہے، اس لیے یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس گھر کا ہر فرد پستول چلانا خوب جانتا ہے — اس لیے اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا — پہلا کام یہ کرو کہ چارپائی کی رسی دوبارہ کس دو تاکہ تمہارے جیل

جانے کے بعد مجھے تکلیف نہ ہو۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"آج نہ جانے کیا بات ہے، سکول میں دل نہیں لگ رہا۔" فاروق نے ایک خالی پیریڈ میں کہا۔

"میرا بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔" محمود بولا۔

"آخر بات کیا ہے؟" فاروق بولا۔

"خدا جانے، ہو سکتا ہے کوئی بات بھی نہ ہو اور ہمیں یونہی محسوس ہو رہا ہو، جیسے کوئی بات ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بات ہی ہو اور ہمارے محسوسات ٹھیک ہوں۔"

"تو پھر..... کیا گھر چلیں؟" محمود نے پوچھا۔

"میرا تو یہی جی چاہتا ہے۔" فاروق بولا۔

"تو پھر لکھو درخواست۔"

اور دونوں نے چھٹی کی درخواست لکھ ماری — ماسٹر کے حوالے کی اور سکول سے باہر نکل آئے — وہ کبھی مشکل سے ہی سکول سے چھٹی کرتے تھے۔ یوں بھی تمام بچوں میں پڑھائی میں آگے تھے۔ اس لیے ماسٹر جانتا

تھا، کلاس کے انچارج کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔

"کیا خیال ہے، فرزانہ کو بھی ساتھ لے لیں؟" محمود نے پوچھا۔

"وہ سکول سے گھر جانا پسند نہیں کرے گی۔" فاروق نے انکار میں سر ہلایا۔

"ہو سکتا ہے، اس کا دل بھی نہ لگ رہا ہو۔" محمود مسکرایا۔

"آج ہم پر 'ہو سکتا ہے' کا دورہ تو نہیں پڑ گیا۔" فاروق نے بھی ہنس کر کہا — لیکن اس کی ہنسی میں وہ زندگی نہیں تھی۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔ میرا خیال ہے، ہم فرزانہ سے پوچھ لیتے ہیں۔ اگر اس نے ساتھ چلنا پسند کیا تو اسے بھی ساتھ لے لیں گے، ورنہ ہم دونوں ہی چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے — لیکن شام کو جب ابا جان چھٹی کرنے کی وجہ پوچھیں گے تو کیا جواب دیں گے؟"

"جو بات ہے، وہی بتائیں گے — صاف صاف کہہ دیں گے کہ سکول میں دل نہیں لگ رہا تھا — دھیان ادھر ادھر جا رہا تھا۔"

"تو پھر چلو، پہلے فرزانہ سے پوچھیں۔"

فرزانہ کا سکول زیادہ فاصلے پر نہیں تھا — وہ جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ لڑکیوں کے سکول میں لڑکوں کا داخلہ بند تھا، اس لیے انہوں نے چوکیدار کے ذریعے فرزانہ کو دروازے پر بلوایا — فرزانہ دروازے پر آئی تو دونوں اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اس کے بال بکھرے

ہوئے تھے۔ آنکھوں میں بے چینی تھی — بس یوں لگتا تھا جیسے اب روئی کہ اب روئی۔

"خیر تو ہے فرزانہ، کیا کسی سہیلی سے لڑائی ہو گئی ہے؟" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں تو۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"پھر کیا بات ہے، تم بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو؟"

"ہاں، نہ جانے کیا بات ہے — میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔"

"یا اللہ رحم —" محمود بولا۔

"تم کیسے آئے؟"

"ہمارے بھی دل بیٹھے جا رہے تھے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ — تو ہم تینوں کی ایک ہی حالت ہے۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"ہاں، ہم تو سکول سے چھٹی لے آئے ہیں اور گھر جا رہے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے، پڑھنا پسند کرو گی یا ہمارے ساتھ چلنا؟" محمود نے پوچھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی — سکول تو آج مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔"

"تو پھر جلدی سے چھٹی لے آؤ — نہ جانے آج کیا بات ہے۔"

"میں ابھی آئی۔"

چند منٹ بعد تینوں گھر کی طرف تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے — پھر

جونہی وہ گھر کے دروازے پر پہنچے، اُن کے کانوں سے ایک گھٹی گھٹی چیخ کی آواز ٹکرائی۔ وہ دھک سے رہ گئے ــــ یہ چیخ ان کی ماں کے حلق سے نکلی تھی۔

اُن کی آمد

"بہت خوب، تم تو بہت دلیر عورت ہو ــــ میں سمجھا تھا، بزدل ہو۔" خوفناک آدمی نے حیران ہو کر کہا ــــ اس کی نظریں بیگم جمشید کے ہاتھ میں پکڑے پستول پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ میں نے کہا ہے، چارپائی کی رسّی دوبارہ کس دو۔"

"اچھا، ابھی کستا ہوں ــــ"

اس نے کہا اور رسّی ہاتھ میں پکڑ کر چارپائی پر جھک گیا لیکن پھر نہ جانے اچانک اس نے کیا کیا کہ رسّی سیدھی بیگم جمشید کے دائیں ہاتھ کی طرف آئی اور پستول کے گرد پیٹتی چلی گئی، ساتھ ہی رسّی کو جھٹکا دیا گیا اور پستول بیگم جمشید کے ہاتھ میں سے نکلتا ہوا خوفناک آدمی کے ہاتھ میں آ گیا۔ بیگم جمشید ہکّا بکّا رہ گئیں ــــ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شخص اس قدر تیز طرار اور پکّا نشانے باز بھی ہو سکتا ہے، ورنہ وہ ہوشیار ہو جاتیں۔

"میں یہاں یونہی نہیں چلا آیا، کچھ سوچ سمجھ کر ہی مجھے بھیجا گیا ہے۔"

"بھیجا گیا ہے ــــ کیا مطلب؟" ان کے منہ سے نکلا۔

"مطلب بتانے کا میں قائل نہیں۔ تم بتاؤ، اب کیا کہتی ہو؟"

"کچھ بھی ہو، تمہیں ناشتا نہیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ دیوار کی طرف منہ کر کے اپنے ہاتھ کمر پر لے آؤ — میں تمہیں باندھ کر بازار سے کچھ کھانے کے لیے لے آؤں گا۔" اس نے کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو، کیا تمہارا یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔"

"کم از کم اس وقت تک جب تک تمہارے تینوں بچے گھر نہیں آجاتے۔"

"کیا مطلب، تم ان سے کیا چاہتے ہو؟" بیگم جمشید نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اصل کام تو انھی سے ہے۔" وہ خوفناک انداز میں مسکرایا اور وہ کانپ اٹھیں — انھوں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ یا خدا، آج محمود، فاروق اور فرزانہ لیٹ ہو جائیں، بہت دیر سے گھر آئیں۔

"کیا کام ہے ان سے؟" انھوں نے ہمت ہارنا کب سیکھا تھا۔

"یہ میں انھی کو بتاؤں گا!"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور چارپائی کی رسی سے بیگم جمشید کے ہاتھ باندھنے لگا۔ اس نے ہاتھ باندھنے پر ہی بس نہیں کی، ہاتھوں کے بعد پیر باندھے، پھر ان کے منہ میں ایک رومال ٹھونسا اور اوپر ایک اور رومال باندھ دیا۔ اب بیگم جمشید کمرے کے فرش پر بندھی پڑی

تھیں — اس طرح کہ منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ کمرے سے باہر نکلا اور کمرے کے دروازے کو بند کر کے باہر سے چٹخنی لگا دی — مطمئن انداز میں مسکرایا اور دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اچانک اسے یاد آیا، اس نے اپنا پستول تو میز پر ہی چھوڑ دیا تھا — میز سے پستول اٹھا کر اس نے دوسری جیب میں رکھا کیونکہ ایک جیب میں تو پہلے ہی انسپکٹر جمشید والا پستول موجود تھا — ایک بار پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی، کیونکہ عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی تھی جب کہ اسے معلوم تھا کہ دو بجے سے پہلے کسی کے آنے کا امکان نہیں ہے — چند لمحے تک وہ کھڑا سوچتا رہا — پھر دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگا —

* * *

"یا اللہ رحم —" محمود نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"اندر تو کوئی گڑبڑ ہے —" فاروق بولا۔

"کہیں امی ریڈیو پر کوئی ڈراما تو نہیں سن رہی ہیں؟" فرزانہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور یہ گھٹی گھٹی چیخ اس ڈرامے میں شامل ہو۔"

"لیکن آواز امی جان کی تھی؟" محمود نے اعتراض کیا۔

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ چیخ امی جان کی تھی۔" فاروق نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں، دروازہ تو اندر سے بند ہے۔"

"ہم گھنٹی بجانے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"کیوں نہ پہلے پائیں باغ والی کھڑکی کا جائزہ لے لیں۔ اگر وہ کھلی ہوئی ملی تو ہم گھنٹی بجائے بغیر بھی اندر داخل ہو سکیں گے۔" فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

"لیکن ہم صبح کھڑکی اندر سے بند کر کے سکول گئے تھے۔" فاروق بولا۔

"اس وقت گھر کے حالات بدلے ہوئے ہیں، اندر نہ جانے کون ہے۔ ہو سکتا ہے، بدلے ہوئے حالات کے تحت کھڑکی کھلی ہوئی ہو۔" محمود نے خیال پیش کیا۔

"تو پھر آؤ، وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔" فاروق گھبرا کر بولا۔

اور وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھے۔ اُسے دھکیلا تو پتا چلا کہ وہ تو اندر سے بند تھی۔

"اب ہمیں گھنٹی ہی بجانا ہوگی۔" محمود بولا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"جلدی بتاؤ۔"

"تم دونوں گھنٹی بجا کر اندر جاؤ، میں ابا جان کو فون کر کے اندر آنے کی کوشش کروں گی۔ اس طرح انہیں بھی اطلاع مل جائے گی۔"

"بہت اچھے — یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

تینوں پائیں باغ سے باہر نکلے — محمود اور فاروق دروازے پر رک گئے اور فرزانہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

محمود نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھی اور دباؤ ڈال دیا — اندر گھنٹی زور سے بجی اور بجتی چلی گئی — پھر وہ دونوں انتظار کرنے لگے۔ یہ لمحے ان کے لیے بہت مشکل سے گزر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے، دروازہ فوراً کھل جائے، پھر چاہے انہیں آگ میں کودنا پڑے۔ وہ اپنی امی کو بچانے کے لیے کود جائیں گے۔ ابھی تک انہیں قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔

"کوئی دروازہ کھولنے کے لیے نہیں آیا۔ اب ہم کیا کریں۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"اندر کوئی لمبا چکر چل رہا ہے — یا اللہ، یہ ہمارے جاتے ہی کیا شروع ہو گیا۔" فاروق بولا۔

"کیوں نہ ہم دروازہ توڑنے کی کوشش کریں — اس طرح محلے کے لوگ بھی تو ہماری مدد کے لیے آ جائیں گے۔" محمود نے مشورہ دیا۔

"جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اندر کیا چکر ہے اور کیا حالات ہیں، اس وقت تک ہم کسی سے مدد نہیں مانگ سکتے — ہو سکتا ہے، مدد الٹی نقصان دہ ثابت ہو۔" فاروق نے کہا۔

"ہوں، یہ بھی ٹھیک ہے — اوہ، خاموش، میرا خیال ہے، کوئی دروازے کی طرف دبے پاؤں آ رہا ہے۔" محمود نے چونک کر دبی آواز میں کہا۔

"یہی بات ہے — لیکن ہم کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ دروازے پر آرام سے کھڑے رہیں گے۔ ہمارا پہلا مقصد اندر جا کر حالات کا جائزہ لینا ہو گا تاکہ معلوم ہو سکے امی کس حال میں ہیں؟"

"ٹھیک کہتے ہو۔" محمود نے فکر مند ہو کر کہا۔

اسی وقت چٹخنی گرنے کی آواز آئی — دونوں نے چہروں پر مسکراہٹ طاری کر لی — جونہی دروازہ کھلا دونوں ایک ساتھ بولے:

"السلام علیکم امی جان....." وہ جان بوجھ کر رک گئے — جانتے تھے کہ دروازہ کھولنے والی ان کی والدہ نہیں ہو سکتیں —

پھر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں — ان کے سامنے ایک خوفناک آدمی کھڑا تھا جو انہیں بری طرح گھور رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"ارے، یہ ہمارا گھر ہے۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اوہ، تو یہ تم ہو — مگر تم سکول سے اتنی جلدی کیوں آ گئے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہماری مرضی، تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟"

"ٹھیک ہے، اندر آ جاؤ۔"

"لیکن تم کون ہو اور ہمارے گھر میں کیا کر رہے ہو؟"

"میں تمہارے سوالات کے جوابات دینے کا پابند نہیں، چلو اندر —"

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے پستول نکال لیا۔ انہوں نے دیکھا پستول ان کے والد کا تھا۔

"اب تو اندر جانا ہی پڑے گا، کیوں محمود؟" فاروق نے شرارتی لہجے میں کہا۔

"ہاں، مجبوری ہے۔" محمود نے کندھے اچکائے۔

دونوں اس کے آگے چلتے ہوئے صحن کی طرف بڑھے۔ خوفناک آدمی دروازہ اندر سے بند کرنا نہیں بھولا تھا — کھانے کی میز کے پاس فرش پر انہیں گرا ہوا کچھ کھانا نظر آیا۔ وہ حیران رہ گئے — خوفناک آدمی انہیں اس سونے والے کمرے میں لے آیا۔

انہوں نے دیکھا، ان کی والدہ رسیوں سے جکڑی فرش پر پڑی ہیں۔ ان کے منہ پر بھی رومال بندھا تھا۔ وہ دنگ رہ گئے۔ ساتھ ہی ان کا رواں رواں سلگ اٹھا، خون جوش مارنے لگا۔ آنکھوں میں شعلے سے بھڑک اٹھے۔

"بدتمیز، پاگل، ہم تمہیں اس حرکت کا مزہ چکھائیں گے۔" محمود نے پاگلوں کی طرح گلا پھاڑ کر کہا۔

"لیکن یہ نہ بھولنا کہ میرے ہاتھ میں تمہارے اپنے باپ کا پستول ہے اور میرا نشانہ تمہارے والد سے بھی زیادہ پختہ ہے۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو، ہم تمہیں ہتھکڑی کا ذائقہ چکھا کر رہیں گے۔"

"تم دونوں بے وقوف ہو، مجھے یہاں کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"تم کون ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟" فاروق نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال تمہاری والدہ نے بھی کیا تھا" اس نے جواب دیا۔

"تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ پہلی فرصت میں ہماری والدہ کو کھول دو، ورنہ تمہارا انجام اتنا بھیانک ہوگا کہ زندگی بھر پچھتاؤ گے۔"

عین اسی وقت گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ وہ چونک اٹھے۔ محمود اور فاروق نے سوچا، یہ ضرور فرزانہ ہوگی، جو فون کر آئی ہوگی۔

جیرال

"اور یہ تمہاری بہن ہوگی۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" خوفناک آدمی نے مسکرا کر کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" فاروق بولا۔

"تم دونوں میرے ساتھ دروازے تک چلو گے، سمجھے۔"

"جی بہت بہتر۔" محمود نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

"سنو، اگر دروازے پر تمہاری بہن موجود ہوئی تو چپ چاپ اس کے لیے دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ آنا۔"

"اچھا۔" دونوں کے منہ سے نکلا۔ ان کے ذہن تیزی سے گردش کر رہے تھے۔

وہ انہیں ساتھ لے کر دروازے پر آیا اور محمود کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ خود دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ محمود نے دروازہ کھول دیا۔ فرزانہ کی آواز سنائی دی:

"کیا اندر سب خیریت ہے، میں نے پھر یونہی فون کیا۔"

محمود اور فاروق دھک سے رہ گئے۔ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ فرزانہ یہ جملہ بول دے گی۔ دوسری طرف خوفناک آدمی بھی بڑے زور سے چونکا۔

پھر اس نے غرا کر کہا:

"اب اندر جانے کی ضرورت نہیں، یہیں ٹھہرو۔"

اُن کے اٹھتے قدم رک گئے۔ فرزانہ بھی بوکھلا گئی — پھر خوفناک آدمی کو دیکھ کر تو اس کی سٹی ہی گم ہو گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے — دوسری طرف خوفناک آدمی جیب سے چاک نکال کر دیوار پر کچھ لکھنے لگا تھا، لیکن لیسے میں بھی اس کی نظر ان تینوں پر جمی تھی۔ وہ اسے حیرت سے دیوار پر لکھتے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا، اس نے دیوار پر صرف ایک نام لکھا تھا "جیرال"۔

اچانک وہ بڑی زور سے اچھلے اور پھر سکتے کی حالت میں کھڑے رہ گئے۔

"تو...... کیا...... تم...... جیرال ہو؟" محمود ہکلایا۔

"ہاں، معلوم ہوتا ہے، تم میرے نام سے واقف ہو۔"

"بہت اچھی طرح — ہم نے اخبارات میں تو پڑھا ہی ہے۔ ہمارے والد نے بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔" فاروق نے جواب دیا۔

"پھر تو تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گے۔ چلو یہ اور بھی اچھا ہے — اچھا، اب سنو — اپنے منہ دروازے کی طرف کر لو۔" اس نے حکم دیا۔

تینوں مڑ گئے —

"اب پھر میری طرف پلٹو۔" اس نے کہا، وہ پلٹے تو انہیں پستول نظر نہیں آیا۔

"پستول اب میرے کوٹ کی جیب میں ہے۔ اس کی نالی کا رخ تمہاری

طرف ہے۔ میں ایک ہی فائر میں تم تینوں کو ڈھیر کر سکتا ہوں۔ یہ بات شاید تمہیں معلوم ہی ہو گی۔"

"ہاں، ہم جانتے ہیں۔"

"بس ٹھیک ہے — تمہیں اتنا کرنا ہے کہ میرے آگے آگے چلتے رہنا، جونہی تم نے کوئی حرکت کی اور میں نے تمہیں گولی ماری — لیکن جب تک تم کوئی حرکت نہیں کرو گے، میں گولی نہیں چلاؤں گا — اب چلو، کہیں تمہارے والد سے بھی یہیں مقابلہ نہ کرنا پڑ جائے — ویسے ان سے مقابلہ تو ہو گا ہی — وہ تمہارے پیچھے ضرور آئیں گے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"تم ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" محمود نے پوچھا۔

"یہ میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔" جیرال نے کہا۔ "بس اب چلو۔"

وہ دروازے سے باہر نکل کر سڑک کی طرف چلنے لگے۔ جیرال اور اس کے کارناموں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے والد نے اس کے بارے میں انہیں بہت کچھ بتایا اور یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر کبھی جیرال سے سامنا ہو جائے تو اس کی ہدایت پر عمل کرنا اور بالکل چوں چرا نہ کرنا۔ وہ جانتے تھے، جیرال ایک ایسا جاسوس ہے جس سے بڑے بڑے ملک معاوضے کر کام لیتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے راز معلوم کرتے ہیں، قائدین وغیرہ اس کے ذریعے غائب کراتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ تینوں حیران تھے اور سوچ رہے تھے، آخر جیرال ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ ایک اتنے بڑے جاسوس کو ہمارے گھر آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ پھر انہیں جیرال کا وہ جملہ یاد آیا،

اس نے کہا تھا، مجھے یہاں کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا گیا ہے۔

یہ سب باتیں سوچ سوچ کر اُن کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ آگے آگے چلتے ہوئے سڑک تک آ گئے — سڑک کے کنارے ایک نیلے رنگ کی کار کھڑی تھی۔ پیچھے سے جیرال کی آواز آئی :

"تمہیں اس کار میں بیٹھنا ہے۔ کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھنا۔ اگر میرے ہاتھ سے مارے گئے تو مجھے بہت افسوس ہوگا — جس طرح تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو، اسی طرح میں بھی تمہیں بخوبی جانتا ہوں۔"

"بہت خوب —" فاروق نے کہا۔

تینوں اپنے ذہنوں کو تیزی سے گردش دے رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے، نہ جانے یہ ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے اور یہ کہ ان کے والد انہیں کس طرح تلاش کریں گے — کر بھی سکیں گے یا نہیں — اگر وہ تلاش نہ کر سکے تو کیا ہوگا — انہوں نے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جانتے تھے، تینوں مل کر بھی جیرال کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ اس کا مقابلہ تو دس آدمی مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے، ان کی تو حیثیت ہی کیا تھی۔ لیکن وہ دوسری قسم کی کوشش تو کر سکتے تھے۔ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے وہ کار کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ اچانک فاروق کو ایک زوردار چھینک آئی۔ اس نے منہ ہی منہ میں کہا :

"شاید میں نزلے کا شکار ہونے والا ہوں — پھر جیب سے اپنا رومال نکال کر ناک صاف کرنے لگا —

"تم رومال سڑک پر نہیں گراؤ گے، میں تمہارے ان کرتبوں سے واقف ہوں" پیچھے سے جیرال کی مسکراتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی اور فاروق نے مایوس ہو کر رومال جیب میں رکھ لیا — عین اسی وقت محمود نے ٹھوکر کھائی —

"ارے ارے، سنبھل کر —" فرزانہ نے گھبرا کر کہا اور اُسے تھامنے کی کوشش میں آگے بڑھی —

"کیا تم لوگ کوئی چال چلنے کی فکر میں ہو؟" جیرال نے چونک کر کہا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں — چھینک کا آنا کوئی عجیب بات نہیں، نہ ہی محمود کے پاؤں کو ٹھوکر لگنا۔"

اتنی دیر میں وہ کار تک پہنچ چکے تھے۔

"اچھا خیر، اس میں بیٹھ جاؤ — تمہاری جیبوں میں کوئی ہتھیار تو نہیں۔"

"جی نہیں —" فاروق بولا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں نے تمہاری تلاشی کیوں نہیں لی جب کہ میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ تم تینوں پروفیسر داؤد کے بنائے ہوئے کھلونے نما ہتھیار اپنی جیبوں میں رکھتے ہو۔"

"اس لیے کہ ہم سکول سے آ رہے تھے — ہتھیار ہم کسی مہم پر جاتے وقت ساتھ لیتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"بہت خوب، تم واقعی بہت عقل مند ہو — میں نے بھی یہی سوچ

کر تمہاری تلاشی نہیں لی تھی۔" جیرال نے مسکرا کر کہا۔

پھر اس نے دونوں طرف کے دروازے بند کرتے ہوئے انہیں تالا لگا دیا۔

"میں اگلی سیٹ پر بیٹھ کر کار چلاؤں گا — میں ایک ہاتھ سے کار چلانے میں ماہر خیال کیا جاتا ہوں اور صرف ایک ہاتھ سے تم تینوں سے نمٹ سکتا ہوں — اس لیے ایک بار پھر بتا تا چلوں، کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا، پھر میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔"

"اچھی بات ہے، ہم کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے۔" فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"میں نے تمہاری بہت تعریفیں سُنی ہیں — یہ بھی سُن رکھا ہے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں، تم چہکتے رہتے ہو۔"

"ہم پرندے نہیں، انسان ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"بہت خوب۔" اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم تینوں کی نوک جھونک اپنے کانوں سے سُن کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ تم پر میرا رعب اس حد تک طاری ہو چکا ہے کہ شاید ہی تم کار میں کوئی بات کر سکو۔"

"نہیں خیر، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" محمود بولا۔

"ویسے فرزانہ، کیا تم نے اپنے والد کو خطرے کی اطلاع دے دی تھی؟" جیرال نے اس طرح پوچھا جیسے وہ مدتوں ان کے ساتھ

رہا ہو۔

"ہاں، میں فون کر کے ہی اپنے دروازے پر آئی تھی۔"

"انھوں نے کیا کہا تھا؟"

"انھوں نے کہا تھا، وہ فوراً پہنچ رہے ہیں، فکر نہ کرنا۔"

"ویسے میں تمہیں ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔" جیرال عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"وہ کیا؟" انھوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"وہ یہ کہ میں ذاتی طور پر انسپکٹر جمشید کی بہت عزت کرتا ہوں، اس لحاظ سے تم تینوں کو بھی پسند کرتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب، آپ پہلے مجرم ہیں جن کی زبان سے ہم اس قسم کے الفاظ سُن رہے ہیں۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"میں اور قسم کا مجرم ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"ویسے آپ نے اب تک یہ نہیں بتایا، ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟" فاروق نے سوال کیا۔

"ابھی نہیں، کچھ دیر بعد بتاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"اب تو ہم کار میں بیٹھ بھی چکے ہیں — اب ہم کسی کو خبردار تو کر نہیں سکیں گے۔" محمود نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

سامنے سے آنے والی کاروں میں اچانک اُسے اپنے ایک دوست کے والد بیٹھے نظر آتے تھے۔ اس نے سوچا، کاش! دوست

کے والد انہیں کار میں بیٹھا دیکھ لیں۔

"دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے — یہ میرا بہت پرانا اصول ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا نہ بتائیں — لیکن ایک بات میں بھی آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں۔" فاروق نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟"

"ہمارے والد ہمارے پیچھے آئیں گے ضرور۔"

"کیا تم کوئی سراغ چھوڑ آئے ہو — میں نے پوری طرح دھیان دیا تھا کہ تم ایسا نہ کرو — اسی لیے جب تم چھپکے تھے اور محمود لڑکھڑایا تھا تو میں ہوشیار ہو گیا تھا — لیکن مجھے سڑک کے کنارے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی جس سے تمہارے والد یہ اندازہ لگا سکیں کہ تم اس جگہ سے کار میں بیٹھ کر روانہ ہوتے ہو۔"

"کچھ بھی ہو، وہ آئیں گے ضرور —" اس نے پختہ یقین سے کہا۔

جیراں نے اس کے الفاظ پر پچھلا منظر دکھانے والے آئینے میں اس کی طرف گھور کر دیکھا اور بولا:

"کوئی بات نہیں، ایک عرصے سے میری خواہش بھی تھی کہ ان سے میرا مقابلہ ہو۔"

"کار پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ آبادی اب بہت پیچھے رہ گئی تھی اور سڑک کے دونوں طرف درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

موٹر بوٹ میں

انسپکٹر جمشید ریسیور ہاتھ سے رکھتے ہی اچھل کر کھڑے ہو گئے اور اکرام سے بولے:

"اکرام، میرے ساتھ چلو۔"

یہ کہہ کر وہ دفتر سے باہر نکل آئے اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف لپکے — اکرام بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا ان تک پہنچا اور ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے موٹر سائیکل پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔

"خیریت تو ہے جناب —"

"نہیں — فرزانہ نے خبر سنائی ہے کہ گھر کے اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ محمود اور فاروق اندر جا چکے ہیں — وہ فون کرنے بیگم شیرازی کے ہاں چلی آئی ہے۔ اب وہ بھی گھر میں جا چکی ہوگی۔"

"کیسی گڑبڑ، کیا اس نے بتایا نہیں؟"

"نہیں کچھ بتانے کا وقت ہی کہاں ہوگا۔"

"بچے آج سکول نہیں گئے؟" اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جب میں گھر سے چلا تھا تو سکول جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے — اب خدا جانے وہ سکول گئے تھے یا نہیں۔" انھوں نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"خدا خیر ہی کرے۔" اکرام کے منہ سے نکلا۔

آندھی اور طوفان کی طرح موٹر سائیکل چلاتے وہ گھر کے دروازے تک پہنچ گئے — ساتھ ہی ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"ارے، یہ کیسے ہو سکتا ہے — دروازہ تو کھلا پڑا ہے۔" انھوں نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، اندر کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔" اکرام بولا۔

"غلط سمجھے، اندر زبردست گڑبڑ ہوئی ہے۔" انھوں نے گھبرا کر کہا اور پھر دوڑتے ہوئے اندر گھس گئے — اکرام ان کے پیچھے دوڑا۔ صحن میں انہیں کچھ بھی نظر نہ آیا — سارا مکان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ باورچی خانے کی طرف لپکے — یہ بھی خالی تھا؛ البتہ اندر بے ترتیبی کا عالم تھا — لمحے بہ لمحے ان کی حیرت اور خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا — آخر وہ سونے والے کمرے میں داخل ہوئے اور پھر دھک سے رہ گئے — بیگم جمشید رسیوں سے بندھی فرش پر بے ہوش پڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ جلدی جلدی انھوں نے ان کی رسیاں کھولیں — انہیں اٹھا کر ایک چارپائی پر ڈالا۔ منہ میں سے رومال نکالا — اتنے میں اکرام ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ انھوں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے، تب کہیں جا کر ان کی آنکھوں کے پپوٹے حرکت میں آئے۔ انھوں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں جھپک جھپک کر انہیں دیکھا، پھر چونک اٹھیں اور چلائیں:

"وہ — وہ — میرے بچوں کو لے گیا۔"

"کیا کہا؟ کون بچوں کو لے گیا؟" انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر پوچھا۔

"میں نہیں جانتی، وہ کون تھا — ہاں، وہ بہت خوفناک شکل صورت کا آدمی تھا، لمبا تڑنگا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں — تفصیل سے بتاؤ — وہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

اور بیگم جمشید نے تفصیل سے انہیں ساری بات بتا دی۔ چند لمحے تک وہ کھڑے سوچتے رہے، پھر بولے:

"لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں کو لے گیا ہے۔"

"محمود اور فاروق اندر آ چکے تھے۔ اس وقت میں ہوش میں تھی، پھر گھنٹی ایک بار پھر بجی تھی۔ اس نے کہا تھا، یہ ضرور تمہاری بہن ہوگی۔ اس پر محمود نے یا فاروق نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ فرزانہ ہی ہوگی — پھر وہ تینوں دروازے پر چلے گئے تھے اور واپس نہیں آئے۔"

"ہوں — خیر تم آرام کرو — اگر اٹھ سکو تو بیگم شیرازی کے ہاں جا کر ڈاکٹر کو بلا لو — ایک ایک سیکنڈ قیمتی ہے — نہ جانے وہ کون تھا اور ان تینوں کو کہاں لے گیا ہے۔ آؤ اکرام ہم چلیں۔" انھوں نے صحن کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"جلدی جائیے، میری فکر نہ کریں۔" بیگم جمشید بولیں۔

وہ گھر سے باہر نکلنے کے لیے دروازے تک آئے اور پھر ٹھٹک کر رک

گئے — انسپکٹر جمشید کی نظریں دیوار پر چاک سے لکھے ایک نام پر جم کر رہ گئیں —

* * *

ان کا سفر دو گھنٹے تک جاری رہا — پھر کار ایک طرف مڑتی نظر آئی — انہوں نے دیکھا، وہ ساحل سمندر پر پہنچ چکے تھے — دُور دُور تک انہیں کوئی انسان نظر نہیں آیا! البتہ ایک طرف سمندر میں ایک موٹر بوٹ کھڑی ہچکولے لے رہی تھی — یہ ایک غیر آباد ساحل تھا۔

"نیچے اُتر آؤ" — جیرال نے سرد آواز میں کہا — اس سے پہلے وہ اس کی آواز میں جو دوستانہ گرمی محسوس کرتے رہے تھے، ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اب اس کے چہرے پر وحشت اور درندگی کا راج تھا —

"گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ، یہ تم یکایک بدل کیوں گئے؟" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تم سے نرم گرم گفتگو اس لیے کرتا رہا کہ کہیں تم کار میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھو — جب کہ تمہیں بخیر و عافیت یہاں تک پہنچانے کا معاہدہ ہوا تھا" اس نے کہا۔

"یہ معاہدہ کس کے ساتھ ہوا تھا؟" محمود نے پوچھا۔

"یہ ایسے راز ہیں جو بچوں کو بتائے نہیں جاتے" اس نے طنزیہ انداز

میں مسکرا کر کہا۔

"چلو خیر — ہمارے والد کو بتا دینا" فاروق مسکرایا۔

"ان کے تو فرشتے بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"کچھ دیر پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ ان سے مقابلہ کرنے کے خواہشمند ہو" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"بالکل ہوں، لیکن مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں کہ وہ یہاں پہنچ سکیں گے"

"دیکھا جائے گا"

وہ کار سے اُتر آئے تھے اور اب موٹر بوٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیرال نے اب پھر پستول ہاتھ میں پکڑ لیا تھا — اچانک پانی کی ایک تیز لہر آئی اور ان کی پنڈلیوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی —

"ارے میری چپل نکل گئی" فاروق چلایا۔

"پروا نہ کرو — موٹر بوٹ میں ننگے پاؤں بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا" جیرال ہنسا —

"لیکن میرے والد کو تو دوسری چپل خریدنی پڑے گی"

"بھول جاؤ انہیں"

"کیا کہا؟ اپنے والد کو بھول جاؤں — یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا کوئی اس طرح بھی اپنے ماں باپ کو بھولا کرتا ہے — یا تمہاری طرف ایسا ہی ہوتا ہے؟"

فاروق نے چپل پھینک کر کہا۔

"اچھا بھائی نہ سمجھو — ذرا تیز تیز چلو" اس نے دوستانہ فضا میں کہا۔

"تم میری سمجھ میں نہیں آتے — کبھی دوست نظر آتے ہو، کبھی دشمن" محمود بولا۔

"میں تو بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آیا، تم کیا سمجھو گے؟"

پانی کی لہر جب واپس گئی تو انہوں نے دیکھا، فاروق کے صرف ایک پیر میں چپل تھی۔

"اسے بھی اتار پھینکو — یوں اچھے نہیں لگ رہے" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"اچھا، یہ لو" فاروق نے کہا اور دوسری چپل بھی اچھال دی — وہ ریت میں گری۔

چاروں آگے بڑھتے چلے گئے — یہاں تک کہ موٹر بوٹ تک پہنچ گئے۔ اب انہوں نے دیکھا، یہ ایک بہت بڑی اور جدید قسم کی موٹر بوٹ تھی — اس میں باقاعدہ کمرے بنے تھے۔

جیرال نے کہا:

"کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو۔ یہ صرف موٹر بوٹ ہی نہیں — ضرورت پڑنے پر آبدوز میں بھی تبدیل کی جا سکتی ہے اور گھنٹوں پانی کے نیچے سفر کر سکتی ہے۔"

"اوہ" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہیلو جارج — ہم آ گئے ہیں" جیرال نے چلا کر کہا۔

فوراً ہی موٹر بوٹ میں ایک کھڑکی سی نمودار ہوئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اس کے بعد موٹر بوٹ کے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک غیر ملکی باہر نکلتا دکھائی دیا۔

"تو یہ ہیں وہ"

"ہاں"

"چلو بٹھاؤ انہیں" اس نے کہا۔

جیرال نے انہیں آگے بڑھنے کا حکم دیا — تینوں موٹر بوٹ میں سوار ہو گئے — اب انہیں اپنے دل ڈوبتے محسوس ہونے لگے تھے۔ انہیں اسی کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا گیا جس کے دروازے پر وہ غیر ملکی جارج نمودار ہوا تھا — کمرے میں ایک میز کے گرد کرسیاں موجود تھیں۔

"ان کرسیوں پر بیٹھ جاؤ" یہ کہہ کر غیر ملکی باہر نکل گیا اور ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند ہو گیا — پھر فوراً ہی انہوں نے موٹر بوٹ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی — انہیں ایک ہلکا سا دھکا لگا، جس سے انہیں معلوم ہو گیا کہ موٹر بوٹ چل پڑی ہے — نامعلوم منزل کی طرف۔

"ہماری آواز اس کمرے سے باہر نہیں جا سکے گی کیونکہ یہ موٹر بوٹ آبدوز بھی ہے — اس لیے تم بے خطر بات چیت کر سکتے ہو" محمود نے انہیں بتایا۔

"خطر کیا — اور بے خطر کیا — یہاں بات چیت کرنے کے لیے

دکھا ہی کیا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"کیا تم مایوس ہو گئی ہو؟" محمود نے کہا۔

"نہیں، مایوسی گناہ ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر خدا کی ذات پر یقین رکھو — ابا جان ضرور آئیں گے۔" فاروق بولا۔

"آخر تمہیں اس قدر یقین کیوں ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"اس لیے کہ ابا جان جیرال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اس کے کام کرنے کے طریقوں سے بھی واقف ہیں — پھر بھلا وہ کیوں نہ آئیں گے۔"

"لیکن اب تو ہم سمندر میں ہیں اور پھر یہ شہر کا وہ ساحل بھی تو نہیں، جہاں سے موٹر بوٹیں اور آبدوزیں چلتی ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر کیوں نہ ہم خود ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کریں۔ اس وقت تو ہم تنہا ہیں۔" محمود نے کہا۔

"لیکن ہم اس بند کمرے میں دشمنوں کے خلاف کیا کر سکتے ہیں۔ پہلے ایک جیرال ہی کیا کم تھا کہ یہ جارج بھی شامل ہو گیا۔" فاروق کے لہجے میں ناامیدی تھی۔

"ہمت نہ ہارو — حوصلہ رکھو — اور دماغ پر زور دو۔" محمود نے انہیں دلاسا دیا۔

"کیوں نہ ہم یہ دروازہ کھولنے کی کوشش کریں۔" اچانک فرزانہ نے

کہا اور دونوں چونک اٹھے۔

"بالکل ٹھیک —" محمود بولا۔

تینوں ایک ساتھ دروازے کی طرف بڑھے۔

انسپکٹر جمشید میدانِ عمل میں

"اُف خدا، تو یہاں جیرال آیا تھا" ان کے منہ سے نکلا۔

"دیوار پر نام لکھ کر جانے کا تو یہی مطلب ہو سکتا ہے" اکرام نے بوکھلا کر کہا۔

"تو وہ تینوں بچوں کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ لیکن کیوں، اس نے ایسا کیوں کیا" انسپکٹر جمشید نے پیشانی پکڑ کر کہا۔

"جیرال ہمیشہ بڑے بڑے ملکوں کے لیے معاوضے پر کام کرتا ہے — ہو سکتا ہے، کسی نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہو"

"آؤ اکرام، جلدی کرو۔ کہیں وہ دُور نہ نکل جائے" انسپکٹر جمشید بوکھلا کر بولے۔

دونوں تیزی سے باہر نکلے اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سڑک کے کنارے پر آئے، یہاں آ کر انھوں نے موٹر سائیکل روک لی۔

"ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کوئی نشانی تو نہیں چھوڑ گئے" وہ بولے۔

"جیرال نے انھیں اس کا کب موقع دیا ہوگا" اکرام نے کہا۔

"ہاں، وہ بہت چالاک ہے، مگر بچے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی سی کوشش ضرور کی ہوگی"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ غور سے جائزہ لینے لگے۔ اکرام محسوس کر رہا تھا کہ وہ وقت ضائع کر رہے ہیں — دفعتاً انسپکٹر جمشید چونکے۔

"دیکھو اکرام، اگرچہ لوگ سڑک پر آ جا رہے ہیں — لیکن اس کے باوجود وہ آثار چھوڑ گئے ہیں" انھوں نے فٹ پاتھ کے ساتھ سڑک پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے"

"اوہو، تم میں غور سے دیکھنے کی عادت نہ جانے کب پیدا ہوگی۔ پاؤڈر کے ان ذروں کو غور سے دیکھو — کیوں، کیا نظر آئے؟"

"لیکن پاؤڈر — بھلا اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے" اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم نہیں جانتے" انسپکٹر جمشید پہلی مرتبہ مسکرائے: "فاروق کی ایک عادت ہے۔ اپنے رومال میں تھوڑا سا پاؤڈر ضرور چھڑک کر رکھتا ہے — اس نے ضرور کسی بہانے سے رومال جیب سے نکالا ہوگا اور رومال یہاں جھٹک دیا ہوگا — اس سے کم از کم یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہاں سے وہ کسی کار یا جیپ میں سوار ہو کر لے جائے گئے ہیں"

"لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کار کس طرف گئی ہے" اکرام نے کہا۔

"فاروق اپنے حصے کا کام کر چکا تھا۔ محمود اور فرزانہ اس کی چال

سمجھ گئے تھے۔ اگلا قدم ان دونوں نے اٹھایا۔" انسپکٹر جمشید سڑک کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا مطلب؟" اکرام بڑے زور سے چونکا۔

"مطلب یہ کہ اس کے بعد محمود نے چلتے چلتے اچانک ٹھوکر کھائی اور فرزانہ اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھی اور اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ اس طرف گئے ہیں۔" انھوں نے ایک سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کس بات سے ثابت ہو رہا ہے؟" اکرام نے حیران ہو کر کہا۔

"لڑکھڑانے کے نشانات جو پاؤڈر کے ذرات کی وجہ سے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔ آؤ اب دیر نہ کرو، میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے۔ اکرام پھر ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔۔۔ ایک بار پھر موٹر سائیکل طوفانی رفتار سے جا رہی تھی۔ اس کا رُخ اب جس سڑک کی طرف تھا، وہ آگے جا کر دو طرف مڑ جاتی تھی، لیکن انسپکٹر جمشید رکے بغیر ایک سڑک پر مڑ گئے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ساحل سمندر پر پہنچ چکے تھے۔

ساحل پر بہت سی موٹر بوٹیں اور آبدوزیں کھڑی تھیں۔ لوگ انھیں کرائے پر لے کر سیر کیا کرتے تھے۔۔۔ دونوں اترے اور ایک

موٹر بوٹ کی طرف بڑھے۔۔۔ اس کا مالک لپک کر ان کی طرف آیا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔

"موٹر بوٹ چاہیے جناب؟" اس نے کہا۔

"ہاں، چاہیے تو۔۔۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ، ابھی ابھی چند منٹ پہلے ایک کار میں تین بچے اور خوفناک سی صورت والا آدمی یہاں آئے تھے۔ وہ موٹر بوٹ میں بیٹھ کر کس طرف گئے ہیں؟"

"ایک خوفناک آدمی۔۔۔۔ تین بچے۔۔۔" اس نے پیشانی پر انگلی رکھ کر کہا۔

"ہاں، بچوں میں ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے۔"

"جی نہیں، میں بہت دیر سے یہاں موجود ہوں۔ ایسی کوئی کار یہاں نہیں آئی۔" اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا

"اچھا، تمہارے خیال میں کوئی اور ایسا ساحل ہے جہاں سے موٹر بوٹیں چلتی ہوں؟"

"صرف یہیں سے چلتی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر کوئی جرائم پیشہ آدمی کسی کو سمندر کے راستے اغوا کرنا چاہے تو وہ کہاں سے لے کر جائے گا۔۔۔ بڑے میاں اس سوال کا جواب خوب سوچ کر دو۔۔۔ میں تمہاری موٹر بوٹ کرائے پر بھی لوں گا اور کرایہ بھی منہ مانگا دوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں، دوسروں کی مدد کرنا میری عادت ہے۔

اگر آپ بوٹ کرائے پر لیں گے تو میں وہی کرایہ لوں گا جو بنے گا۔ نہ لیں گے تب بھی وہ باتیں آپ کو ضرور بتاؤں گا جو مجھے معلوم ہیں — یہاں سے چند میل دور ایک چھوٹا سا غیر آباد ساحل ہے — دو ایک بار میں نے وہاں ایک بڑی سی نئی قسم کی موٹر بوٹ کھڑی دیکھی ہے:

"اوہ" انسپکٹر جمشید پر جوش انداز میں بولے۔

"تو پھر بڑے میاں، اس طرف لے چلو — لیکن ٹھہرو، پہلے میں سائیکل ایک طرف کھڑی کر دوں"

موٹر سائیکل سٹینڈ پر رکھ کر وہ موٹر بوٹ میں سوار ہو گئے۔

"آپ جس قدر تیز چل سکتے ہو چلو" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس ساحل کی طرف؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں"

بوڑھے نے موٹر بوٹ گھمائی اور پوری رفتار پر چھوڑ دی۔ وہ کافی ماہر معلوم ہوتا تھا۔ پانی کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس لیے انھیں اونچی آواز میں بات کرنا پڑ رہی تھی۔

"چکر کیا ہے؟" بوڑھے نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"کچھ غیر ملکی تین بچوں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں"

"اوہ، یہ تو بہت بھیانک جرم ہے" اس نے کانپ کر کہا۔

"ہاں — اور تم اس معاملے میں ہماری مدد کر رہے ہو۔ یہ بہت بڑی نیکی اور ملک اور قوم کی خدمت ہے" انسپکٹر جمشید نے اس کی تعریف

"شکریہ جناب، یہ تو میرا فرض ہے"

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اس ساحل پر پہنچ گئے لیکن یہاں دور دور تک کوئی نہ تھا۔

"کنارے پر روک لو۔ ہم ذرا اتر کر جائزہ لیں گے"

"اچھا"

انسپکٹر جمشید اور اکرام موٹر بوٹ سے کود کر اتر آئے اور ریت پر چلتے ہوئے خشکی کی طرف بڑھنے لگے — کچھ دور چل کر انھیں ایک نیلی کار نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

"وہ اسی کار پر لائے گئے ہیں" انسپکٹر جمشید نے پر جوش انداز میں کہا۔

"کار میں سے مخصوص خوشبو آ رہی ہے — یہ محمود استعمال کرتا ہے"

وہ مسکرائے — پھر واپس مڑ کر ریت پر نظریں دوڑانے لگے۔ اچانک وہ چلائے:

"ارے، وہ چپل اٹھانا"

چپل انھیں بوڑھے کے قریب نظر آیا تھا جو ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے چپل اٹھایا اور ان کی طرف بڑھا۔ چپل کو نزدیک سے دیکھتے ہی انسپکٹر جمشید کانپتی ہوئی آواز میں بولے:

"یہ چپل فاروق کا ہے"

"کیا آپ کو یقین ہے" اکرام کے منہ سے نکلا۔

"بالکل — مجھے سو فیصد یقین ہے" انھوں نے کہا اور بوڑھے کی طرف مڑے۔

"کیا یہاں آس پاس کوئی جزیرہ موجود ہے؟"

"جزیرہ — جزیرے تو کئی ہیں۔"

"تو پھر چلو — وہ لوگ ضرور بچوں کو کسی جزیرے پر لے گئے ہیں۔"

"آیئے میں آپ کو نزدیک ترین جزیرے پر لے چلوں۔" بوڑھا بولا۔
وہ ایک بار پھر موٹر بوٹ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

* * *

دروازہ کھولنے کی انھوں نے لاکھ کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ان کے پاس چابیوں کا گچھا تو تھا نہیں کہ اس کو آزماتے، نہ ہی کوئی کیل وغیرہ تھی۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" محمود نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اور کیا — دروازہ کھول کر بھی ہم کیا کریں گے۔ کیا سمندر میں تیر کر کنارے تک پہنچیں گے۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"چلو ٹھیک ہے — آرام کرو۔"

تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جلد ہی ان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور جیرال کی شکل دکھائی دی۔

"باہر آ جاؤ — اندر بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہو گے۔"

"بہت خیال ہے تمھیں ہمارا۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"اگر خیال نہ ہوتا تو صحیح سلامت یہاں تک نہ آ سکتے۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"یہاں ایک بہت پر فضا جزیرہ ہے، ذرا تمھیں اس کی سیر کرائیں گے، پھر آگے چلیں گے۔" جیرال نے وحشیوں کی طرح ہنس کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا اور باہر نکل آئے۔ یہاں جارج تنہا کھڑا تھا۔

"چلو، نیچے اترو۔" اس نے غرّا کر کہا۔

جزیرہ واقعی پر فضا تھا — درخت بہت لمبے لمبے، گھنے اور سرسبز تھے۔ کئی درختوں پر انھوں نے پھل لدے دیکھے۔ ان میں بعض پھل ایسے بھی تھے جو انھوں نے آج تک نہیں کھائے تھے۔

"اس جزیرے پر اس وقت ہماری حکومت ہے۔" جیرال نے ہنس کر کہا۔

"اچھا — پھر کیا ارادہ ہے؟"

"وقت آ گیا ہے کہ تمھیں سب کچھ بتا دیا جائے۔ بس چند منٹ ٹھہرو۔"

جزیرے کی زمین ریتیلی تھی۔ کہیں کہیں گھاس بھی اگا ہوا تھا۔ جزیرے کے بیچوں بیچ پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ یہاں تین غیر ملکی آرام کرسیوں پر بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ ان کے سامنے میز پر گلاس اور شربت کی قسم کے کسی مشروب کی بوتل رکھی تھی۔ وہ بھی انھیں دیکھ کر سیدھے ہو گئے۔

"بہت خوب جیرال — تو تم انھیں لے ہی آئے۔" ان میں سے ایک نے خوش ہو کر کہا۔

"انہیں لانا بھی کوئی مشکل کام تھا ماسٹر۔" جیرال نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مزہ تو تب ہے، جب ان کا باپ بھی ان کے پیچھے چلا آئے۔"

اس آدمی نے کہا جسے جیرال نے ماسٹر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"وہ بھی آئے گا ماسٹر — وہ بہت چالاک ہے لیکن ہمارے جال سے بچ نہیں سکتا۔ اپنے تین بچوں کے لیے اسے آنا ہی پڑے گا اور اگر نہیں آئے گا تب بھی جیت ہماری ہی ہوگی — کیا بچوں کا گم ہو جانا اسے زندہ در گور نہیں کر دے گا — پھر کس کام کا رہ جائے گا۔ ان بچوں کو بھی خوب چکر دے کر یہاں تک لایا ہوں۔ میں نے انہیں احساس دلا دیا تھا کہ یہ ایک دوست کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔"

"بہت خوب جیرال، تمہارا جواب نہیں — بڑی بڑی حکومتیں تم سے یونہی تو کام نہیں لیتیں — لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انسپکٹر جمشید کس طرح یہاں پہنچے گا۔ ظاہر ہے کہ تم نے انہیں راستے میں کوئی آثار چھوڑنے نہیں دیے ہوں گے۔"

"میں نے دوہری چال چلی ہے۔ ایک طرف تو انہیں کوئی نشانی کسی جگہ پر گرانے کی اجازت نہیں دی، دوسری طرف میں ان کے گھر کی دیوار پر چاک سے جیرال لکھ آیا ہوں۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ یہ گفتگو سن کر حیران ہو رہے تھے۔ اب ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ دراصل ان لوگوں نے ان کے والد پر قابو پانے کا ایک خوفناک منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کو بنانے والا جیرال تھا۔ سب کچھ

اس کی ہدایت کے مطابق ہو رہا تھا۔ اگرچہ اغوا کرانے والے اور نہ جانے ماسٹر اور اس کے ساتھی کس ملک سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں انسپکٹر جمشید سے کیا دشمنی تھی۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا، ان پانچ دشمنوں کے سوا انہیں دُور دُور کوئی نظر نہ آیا — یہ جزیرہ غیر آباد تھا — یوں بھی شہر سے بہت دور تھا۔ کوئی سیر و تفریح کرنے والا گروپ بھی ادھر مشکل سے ہی آ سکتا ہوگا۔

اس سے پہلے وہ یہ دعا کرتے رہے تھے کہ ان کے والد انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں — لیکن اب وہ یہ دعا کر رہے تھے، یا اللہ، ہمارے والد ہم تک نہ پہنچیں —

جزیرے میں

نزدیک ترین جزیرے پر انہیں لوگوں کے چند گروپ نک... نظر آئے — وہ حیران تھے کہ اکرام، محمود، فاروق اور فرزانہ کو اس جزیرے پر نہیں لایا گیا۔ بوڑھا بھی ان کے ساتھ تھا — اس نے کہا:

”کوئی بات نہیں — یہاں اور بھی بہت سے جزیرے ہیں۔ آئیے ہم ان پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔“

جزیروں کی تلاش میں انہیں ایک گھنٹہ لگ گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا — آخر انسپکٹر جمشید بولے:

”بڑے میاں، کیا آپ کسی ایسے جزیرے سے واقف نہیں جو یہاں سے بہت فاصلے پر ہو اور غیر آباد بھی ہو؟“

یہ سن کر بوڑھا سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا:

”جی ہاں، ایک جزیرہ ایسا ہے تو سہی — لیکن وہ بہت دور ہے۔“

”کیا وہاں لوگ سیر کرنے جاتے ہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر وہیں چلو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”اچھا صاحب۔“

ایک بار پھر وہ موٹر بوٹ میں روانہ ہوئے۔ انسپکٹر جمشید کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا — وہ سوچ رہے تھے کہ اگر اس غیر آباد جزیرے پر بھی بچے نہ ملے تو وہ کیا کریں گے، کہاں جائیں گے۔ اکرام بھی خاموش تھا — بھاگم دوڑ نے یوں بھی انہیں بری طرح تھکا دیا تھا — آخر آدھ گھنٹے تک تیز رفتاری سے سفر کرنے کے بعد وہ جزیرہ انہیں دکھائی دینے لگا۔ انسپکٹر جمشید نے دور سے دیکھا، ایک بڑی سی موٹر بوٹ اس کے کنارے کھڑی تھی۔

”کیا یہ وہی موٹر بوٹ ہے جو تم نے اس غیر آباد ساحل پر کئی بار کھڑی دیکھی ہے؟“ انسپکٹر جمشید نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”جی ہاں، وہی لگتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہم اس جزیرے پر اتریں گے۔“ وہ بولے۔

بوڑھے نے موٹر بوٹ کنارے کے ساتھ لگاتے ہوئے روک لی۔

”کیا میں بھی آپ کے ساتھ آؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں بڑے میاں، ہماری وجہ سے تم پر کوئی مصیبت کیوں آئے، تم یہیں ٹھہر کر ہمارا انتظار کرو — اگر ہم دو گھنٹے تک واپس نہ آئیں تو تم پولیس کو اطلاع دے دینا اور یہ اپنا کرایہ بھی رکھ لو۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے جیب سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

”ابھی رہنے دیں، ابھی تو آپ کو واپس بھی چلنا ہے۔ بعد میں لے لیں گے — آپ فکر نہ کریں، میں یہاں پورے دو گھنٹے تک انتظار کروں گا — اگر آپ کی واپسی نہ ہوئی تو پولیس کو خبر کر دوں گا۔“

"تمہارا بہت بہت شکریہ بڑے میاں، تم بہت اچھے آدمی ہو۔"
انھوں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا اور موٹر بوٹ سے جزیرے پر اتر گئے۔ اکرام
ان کے پیچھے تھا۔

وہ جزیرے کے درمیانی حصے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ پھر انسپکٹر جمشید
دبی آواز میں بولے:

"اکرام، وہ بچوں کو اسی جزیرے پر لائے ہیں — اگرچہ زمین ریتلی ہے
لیکن کہیں کہیں ان کے قدموں کے نشان موجود ہیں — محمود اور فرزانہ کے
پیروں میں چپل موجود ہیں جب کہ فاروق ننگے پاؤں ہے۔ اس نے تو اپنے
چپل بھی راستہ دکھانے کے لیے ساحل کی ریت پر ہی چھوڑ دیے تھے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں — پیروں کے نشانات کہیں کہیں مجھے بھی دکھائی
دیے ہیں۔"

"اور یہ بھی بتا دوں — انھیں یہاں تک صرف دو آدمی لے کر آئے ہیں۔
ان میں سے ایک یقیناً جیرال ہے، دوسرا کوئی اور ہوگا۔" انھوں نے آگے
بڑھتے اور زمین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب ہم کیا کریں — کیا اپنے پستول نکال لیں؟" اکرام نے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں — انھوں نے پورا انتظام کر رکھا ہوگا — تم
جیرال کو کیا سمجھتے ہو — وہ بہترین منصوبے بنانے کا بہت بڑا ماہر ہے۔
یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں اس سے کام لیتی ہیں اور....."
انسپکٹر جمشید کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرائے

تھے۔

"اور کیا؟" اکرام نے پوچھا۔

"اور..... یہ..... کہ..... میرا خیال ہے، ہم جال میں پھنس گئے ہیں۔"
انھوں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی کیا مطلب؟" اکرام بُری طرح چونکا۔

"ہاں اکرام، دشمن کی چال میری سمجھ میں چند لمحے پہلے آئی ہے۔ انھوں
نے بچوں کو جیرال کے ذریعے اغوا کرانے کا پروگرام صرف اس لیے بنایا ہے
کہ میں ان کو تلاش کرتا ہوا ان تک پہنچ جاؤں گا — جیرال کے نام کے
ساتھ ہی سمندر ذہن میں آتا ہے — کیونکہ عام طور پر یہ سمندروں میں سفر
کرتا ہے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ میں سمندر کی طرف جاؤں گا اور پھر
کوئی موٹر بوٹ والا مجھے اس جزیرے تک پہنچا دے گا۔"

"اوہ —" اکرام کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساری سکیم جیرال کی ہو اور اس سے کام لینے
والے صرف تماشائی کی حیثیت سے موجود ہوں۔"

"کیا یہ جزیرہ ہماری حکومت میں شامل نہیں؟" اکرام نے پوچھا۔

"ضرور شامل ہے، لیکن غیر آباد ہے۔ ہم یہاں مدد کے لیے کسی کو کیسے
بلا سکتے ہیں؟" انھوں نے بتایا۔

"تو کیا ہم پھنس چکے ہیں؟"

"شاید — یہ تو آگے چل کر ہی معلوم ہوگا۔"

پھر وہ جزیرے کے بیچوں بیچ پہنچ گئے — یہاں کچھ درختوں کے نیچے ایک کرسی کے گرد پانچ کرسیاں پڑی تھیں، لیکن ان کے پاس کوئی نہ تھا۔ انھوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں — پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں چلائے۔

"محمود، تم کہاں ہو؟"

انھیں اپنی آواز کی گونج سنائی دی مگر بچوں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا — دوبارہ انھوں نے اپنے حلق سے پھر آواز نکالی، لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

"ہو سکتا ہے، وہ یہاں نہ لائے گئے ہوں" اکرام نے مایوس ہو کر کہا۔

"نہیں میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ یہیں کہیں موجود ہیں۔ دشمنوں نے انھیں حلق سے آواز نہ نکالنے کی ہدایت کر رکھی ہوگی" انھوں نے کہا — پھر اچانک وہ چونک اٹھے — ایک آواز ان سے مخاطب تھی:

"خوش آمدید انسپکٹر، ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔"

× × ×

بیگم جمشید کے اوسان بحال ہوئے تو وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیگم شیرازی کے گھر پہنچیں۔ انھیں سارے واقعات تفصیل سے بتائے تو وہ دھک سے رہ گئیں — پھر بیگم جمشید نے خان رحمان اور پروفیسر داؤد کو فون

کیے —

تھوڑی دیر بعد ان کے گھر میں بیگم شیرازی کے علاوہ پروفیسر داؤد، شائستہ سمیت اور خان رحمان اپنے تینوں بچوں حامد، سرور، ناذ اور بیگم شہناز کے ساتھ موجود تھے۔

"میں ڈی آئی جی صاحب کو فون پر حالات بتا آیا ہوں۔ انھوں نے تلاش کا سلسلہ شروع کروا دیا ہوگا" خان رحمان نے انھیں بتایا۔

"اور میں نے تمام بڑے بڑے افسروں کو اطلاع دی ہے۔ امید ہے کہ بڑے پیمانے پر انھیں تلاش کیا جا رہا ہوگا" پروفیسر بولے۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ" بیگم جمشید بجھی بجھی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولیں۔

"بھابی فکر نہ کریں — کوئی ان تک پہنچے نہ پہنچے، جمشید ضرور پہنچے گا — اور انشاءاللہ وہ انھیں لے کر آتا ہی ہوگا" خان رحمان نے کہا۔

"بالکل، مجرم تو اس کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں۔ نہ جانے انھیں یہ جرأت کس طرح ہوئی" پروفیسر بولے۔

"مجھے وہ آدمی بہت خطرناک دکھائی دے رہا تھا" بیگم جمشید نے بتایا۔

"کوئی بات نہیں، اللہ سے دعا کریں۔"

پھر وہ سب ان کا دھیان بٹانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے

گئے۔

وقت بہت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا اور جوں جوں گزر رہا تھا، ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا — اچانک دروازے کی گھنٹی بجی :

"یا اللہ خیر"

خان رحمان کے منہ سے نکلا — ساتھ ہی وہ دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے — دروازے پر انہیں ایک سب انسپکٹر نظر آیا —

"مجھے خان صاحب نے بھیجا ہے" اس نے بتایا۔

"ڈی آئی جی صاحب نے ؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں، سارے شہر میں بچوں کی تلاش شروع ہو چکی ہے — تمام جرائم پیشہ لوگوں کو چیک کیا جا رہا ہے — مجرموں کے اڈوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا — تلاش بدستور جاری ہے"

"انسپکٹر جمشید اور اکرام بھی کہیں نہیں ملے"

"جی نہیں"

"تب پھر وہ ضرور اغوا کرنے والوں کے پیچھے لگے ہوئے ہوں گے"

خان رحمان نے خیال ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے" اس نے کہا۔

پھر وہ اجازت لے کر چلا گیا — خان رحمان نے اندر آ کر ساری بات بتائی اور ایک بار پھر وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

جیرال سے سامنا

انسپکٹر جمشید درختوں کے جھنڈ میں سے آتی ہوئی اس آواز کو سن کر چونکے نہ گھبرائے بلکہ دبے لفظوں میں اکرام سے بولے :

"میرا خیال ہے، یہ جیرال ہے — اسے دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ"

جیرال جھنڈ میں سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا اور قدم اٹھاتا ہوا ان کے بالکل نزدیک پہنچ گیا — ایک بین الاقوامی مجرم کو وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے اور وہ بھی اس قدر نزدیک سے — چند لمحوں تک انسپکٹر جمشید اور جیرال ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے — دونوں طرف سے کسی نے بھی پلک تک نہ جھپکی۔ آخر جیرال ہی بولا :

"ہیلو انسپکٹر، مجھے تم سے ملنے کی بہت آرزو تھی"

"گویا — تم نے یہ سب مجھ سے ملاقات کرنے کی خاطر کیا ہے"

انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ تو نہیں کہا جا سکتا — ایک حکومت نے میری خدمات حاصل کیں اور میں تیار ہو گیا — منصوبہ تم سے متعلق تھا، اس لیے میں بہت خوش ہوا کہ چلو اس بہانے تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی"

"بہت خوب، تمہیں زندہ دل جیرال کہا جاتا ہے اور آج میں بھی

کہتا ہوں۔ تمہیں یہ نام غلط نہیں دیا گیا۔" انسپکٹر جمشید نے اس کی دلیری کی تعریف کی۔

"شکریہ انسپکٹر، میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں، اس لیے ایک عرصے سے میری یہ خواہش بھی تھی کہ کبھی ہم دونوں میں مقابلہ ہو۔ قدرت نے آج ایک ہی وقت میں میری دو خواہشیں پوری کر دیں۔ تم سے ملاقات بھی ہو گئی اور آج مقابلہ بھی ہو گا۔"

"ضرور، لیکن میرے بچوں کا کیا قصور ہے؟" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"انہیں چارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ میں جانتا تھا تم کسی نہ کسی طرح انہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جاؤ گے۔"

"تو منصوبہ تمہارا ہی بنایا ہوا تھا!"

"ہاں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"بچے ہیں کہاں؟" انہوں نے پوچھا۔

"فکر نہ کرو — وہ خیریت سے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے انسپکٹر جمشید، کہ تمہارے بچوں سے مل کر بھی بہت خوش ہوا ہوں۔ انہوں نے میری ہدایات پر بھی پوری طرح عمل کیا ہے — بس ایک بار فاروق نے چھینک مار کر رومال گرانے کی کوشش کی تھی — لیکن میرے مقابلے میں اس کی یہ چال ناکام ہو گئی۔"

"یہاں تم غلطی پر ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"ان تینوں نے ہی مجھے یہ اشارہ دینے کی کوشش کی تھی کہ انہیں اس طرف لے جایا جا رہا ہے اور تم یہ سن کر ضرور حیران ہو گے کہ وہ سو فی صد کامیاب ہو گئے تھے۔"

"یہ غلط ہے — میں نے پوری طرح خیال رکھا تھا، کیونکہ میں اپنا نام تمہارے مکان کی دیوار پر لکھ آیا تھا۔ اس کے بعد اگر تمہیں محمود وغیرہ کی طرف سے چھوڑی ہوئی کوئی نشانی نظر آ جاتی تو تم فوراً سمجھ جاتے کہ جال بچھایا گیا ہے۔ اس صورت میں تم پوری طاقت ساتھ لے کر آتے۔"

"تم غلط فہمی میں مبتلا ہو — دراصل فاروق نے رومال گرانے کے متعلق تو سوچا ہی نہیں تھا — وہ ہمیشہ رومال پہ پاؤڈر چھڑک کر رکھتا ہے۔ اس نے رومال جھٹک کر پاؤڈر کے ذرات سڑک پر گرائے تھے — پھر محمود نے ٹھوکر کھائی تھی، فرزانہ نے اسے سنبھالا تھا اور اس طرح انہوں نے اپنے قدموں کے نشانات سے سمت کا اشارہ مجھے دیا تھا۔"

"اوہ —" جیرال کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"پھر غیر آباد ساحل پر فاروق نے اپنی چپل بھی تو چھوڑی تھی۔"

اس کے بارے میں تو مجھے معلوم ہو گیا تھا، لیکن میں نے کوئی توجہ نہیں دی، کیونکہ میں جانتا تھا، تم آباد ساحل کی طرف سے جزیروں کی تلاش میں نکلو گے۔"

"خیر یہ تو ہوا — اب تم بتاؤ بچے کہاں ہیں؟"

اکرام یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ آخر انسپکٹر جمشید جیرال سے

دوستانہ فضا میں کیوں گفتگو کر رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر اسے گرفتار نہیں کر لیتے۔ اس وقت جیرال کی نظر اکرام پر پڑ گئی۔

"انسپکٹر، یہ شاید تمہارا اسسٹنٹ ہے۔"

"ہاں، یہ اکرام ہے۔"

"میں بتاؤں ۔۔۔ یہ سوچ رہا ہے کہ تم مجھے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے۔" اس نے مسکرا کر کہا ۔۔۔ اور اکرام حیرت زدہ رہ گیا۔

"میں بھی یہ بات جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔ "تم نے اب تک بتایا نہیں کہ بچے کہاں ہیں؟"

"مسٹر جارج، بچوں کو لے آئیں۔ انسپکٹر صاحب کو انہیں دیکھے بغیر چین نہیں آئے گا۔"

درختوں کے جھنڈ میں سے نہ صرف بچے اور مسٹر جارج نکل کر باہر آ گئے، بلکہ ماسٹر اور اس کے دونوں ساتھی بھی ان کی طرف بڑھنے لگے ۔۔۔ انسپکٹر جمشید کی نظر جونہی ماسٹر پر پڑی، وہ بڑے زور سے چونکے۔ ان کے منہ سے نکلا:

"تم ۔۔۔"

"ہاں، میں۔" اس نے پراسرار انداز میں کہا۔

"اکرام، ہمارے دشمن ملک کے سب سے بڑے سراغ رساں سے ملو۔ یہ اپنے ملک میں ماسٹر کے نام سے مشہور ہیں۔"

"اوہ!" اکرام کے منہ سے نکلا۔ اس نے ماسٹر کے بہت چرچے سنے تھے۔

"مجھے حیرت ہے، تم نے بندوق جیرال کے کندھے پر رکھ کر کیوں چلائی۔ کیا تم خود یہ کام نہیں کر سکتے تھے؟"

"جیرال آج کل مستقل طور پر ہمارے ملک کے لیے کام کر رہا ہے۔ ہم دونوں دوست بن چکے ہیں۔ میں نے اس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تھا کہ انسپکٹر جمشید کی وجہ سے ہمارے بہت سے جاسوس پکڑے جا چکے ہیں۔ کوئی ایسا منصوبہ بناؤ کہ تم ہمارے قبضے میں آ جاؤ ۔۔۔ سو اس نے صرف تین منٹ میں منصوبہ بنا ڈالا۔"

"بہت خوب، تو یہ بات ہے ۔۔۔ اچھا، اب تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟" انسپکٹر جمشید نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے وہ سب یہاں پکنک منانے آئے ہوں۔

"یہ تمہیں جیرال بتائے گا، کیونکہ منصوبہ اس نے بنایا ہے۔ میں تو صرف بطورِ نگران آیا ہوں۔"

"چلو جیرال تم بتاؤ۔"

"پہلے اپنے بچوں کی خیریت تو دریافت کر لو ۔۔۔ دیکھ لو ہم نے انہیں نقصان نہیں پہنچایا۔"

"تم جیسے بڑے مجرم ایسی گری ہوئی حرکت کر بھی نہیں سکتے۔ میں جانتا ہوں ۔۔۔ تم پروگرام بتاؤ۔"

"پروگرام یہ ہے کہ ہم نہیں چاہتے، تم یہاں سے واپس جاؤ۔ البتہ تمہارے بچے اور تمہارا اسسٹنٹ جا سکتے ہیں۔"

"انھیں سے بچاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے بے خوف ہو کر کہا۔

"تم پوری طرح گھر چکے ہو — اپنے چاروں طرف کے درختوں پر نظر ڈال لو — تمہیں چار درختوں پر ایک ایک آدمی بیٹھا نظر آئے گا — ان کے ہاتھوں میں مشین گنیں ہیں جو آن کی آن میں تمہیں بھون سکتی ہیں — لیکن ہم نے آج تک بزدلوں جیسے کام نہیں کیے — اس لیے تمہیں پورا پورا موقع دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا — اس کی باتیں محمود، فاروق اور فرزانہ کے جسموں میں سنسنی دوڑائے جا رہی تھیں۔

"تم نے بات پھر درمیان میں چھوڑ دی۔" انسپکٹر جمشید چاروں طرف ایک نظر ڈال کر بولے۔

"تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنا ہوگا — اگر تم نے مجھے شکست دے دی تو تمہیں یہاں سے زندہ جانے دیا جائے گا، ورنہ یہ لوگ تمہاری لاش کو لے جا سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بہت خوب، لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں ہاں، ضرور —" جیرال نے کہا۔

"میرے اسسٹنٹ اور بچوں کو میرے سامنے یہاں سے جانے دیا جائے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ جا کر مدد لے آئیں گے۔" جیرال نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں، یہ یہاں آج شام سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔ میں انہیں سختی سے اس کی ہدایت کر دیتا ہوں۔"

"لیکن تم انہیں پہلے ہی کیوں رخصت کر دینا چاہتے ہو۔"

"تاکہ کم از کم یہ تو محفوظ رہیں۔"

"بے فکر رہو، انہیں خراش تک نہیں آئے گی۔" جیرال نے وعدہ کیا۔

"لیکن میرا اطمینان اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔" انھوں نے کہا۔

"اچھی بات ہے، میں انہیں جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ تمہاری ہدایت پر عمل کریں گے۔ تم وعدے کے پکے ہو۔"

"ٹھیک ہے، اکرام! تم بچوں کو لے کر چلے جاؤ — اور دیکھو شام سے پہلے واپس نہ آنا۔"

اکرام اور بچوں نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی۔

"ہم نہیں جائیں گے ابا جان۔"

"میں بھی نہیں جاؤں گا۔" اکرام نے مضبوط لہجے میں کہا۔

انسپکٹر جمشید نے انہیں بہت سمجھایا، لیکن وہ نہ مانے — اگر وہ انہیں حکم دیتے تو شاید انہیں جانا ہی پڑتا — لیکن انھوں نے حکم نہیں دیا — آخر فیصلہ ہوا کہ وہ لڑائی کے انجام تک یہیں ٹھہریں گے۔

"اب مقابلہ شروع ہو جانا چاہیے۔" جیرال بولا۔

"ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا۔

"آپ سب لوگ دور ہٹ جائیں بلکہ درختوں کی اوٹ لے لیں۔" جیرال نے باقی لوگوں سے کہا۔

ان کے ہٹنے کے بعد جیرال اور انسپکٹر جمشید ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ باقی سب لوگوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ خاص طور پر محمود، فاروق، فرزانہ اور اکرام کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ انہیں پرانے زمانے کی وہ لڑائیاں یاد آ گئیں جب فوجوں کے جنگ شروع کرنے سے پہلے ایک اور ایک کا مقابلہ ہوتا تھا۔

وہ سب پلکیں جھپکائے بغیر میدان میں کھڑے دو جنگجو انسانوں کو دیکھ رہے تھے — دور — بہت دور — خیالوں میں انہیں ڈھول بجتا محسوس ہوا۔

خوفناک جنگ

"کس چیز سے مقابلہ کرنا پسند کرو گے انسپکٹر؟" جیرال نے ان سے کہا۔

"تم ایک بہادر دشمن ہو، میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور تم پر چھوڑتا ہوں۔ جس ہتھیار سے بھی مقابلہ کرنا پسند کرو۔"

"تو پھر پستول ہی ٹھیک رہیں گے۔" جیرال نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

جیرال نے اپنی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور دو پستول نکالے۔ پھر ایک انسپکٹر جمشید کی طرف اچھالتے ہوئے بولا:

"سنبھالو انسپکٹر، یہ تمہارا ہی ہے — گولیاں چیک کر لو — پھر نہ کہنا میں نے تمہیں دھوکا دیا۔" جیرال نے کہا اور اپنے پستول کی گولیاں چیک کرنے لگا — انسپکٹر جمشید نے بھی گولیاں دیکھیں اور بولے:

"ٹھیک ہے۔"

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور پھر کمر سے کمر ملا کر مخالف سمتوں میں قدم اٹھانے لگے۔ لڑائی کے اس طریقے کو ڈوئل کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب دو

آدمی جھگڑ پڑتے تھے تو اس طرح فیصلہ کرتے تھے کہ کسے زندہ رہنا ہے اور کسے مرنا ہے — کمر سے کمر ملا کر دونوں دس قدم مخالف سمتوں میں بڑھتے اور پھر تیزی سے گھومتے ہوئے اپنے مدمقابل پر فائر جھونک مارتے۔

وہ ایک ایک قدم گن رہے تھے — ایک ایک قدم پر دوسروں کے دل دھڑک رہے تھے — موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ صرف چند سیکنڈ میں — پھر جونہی دس قدم پورے ہوئے، دونوں ایک ساتھ بجلی کی سی تیزی سے مڑے اور ایک دوسرے پر فائر جھونک مارے۔

تماشائیوں نے دیکھا، دونوں اپنی پھرتی کی وجہ سے بچ گئے تھے اور بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑے تھے — انھوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا — شاید انہیں اپنے اپنے نشانے پر یقین تھا۔

"یہ کیا ہوا انسپکٹر!" جیرال نے کہا۔

"ایک ہتھیار بے کار ثابت ہو گیا تو کیا ہوا، کوئی اور ہتھیار سنبھال لو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت خوب، یہ ہوئی نا بات — خنجروں کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"اگر مل سکیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہم ہر طرح تیار ہو کر آتے ہیں۔" جیرال ہنسا، پھر درختوں کی طرف منہ کر کے بولا:

"مسٹر جارج، ہمیں خنجر دے دیں۔"

جارج اوٹ سے باہر نکل آیا — اس کے ہاتھ میں دو خنجر تھے جو

دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے — خنجروں کو دیکھ کر ان کے دلوں کی دھڑکن اور بھی تیز ہو گئی — جارج نے دونوں خنجر جیرال کو دے دیے — جیرال خنجر لے کر آگے بڑھا اور بولا:

"لو انسپکٹر، ان میں سے ایک پسند کر لو۔"

انسپکٹر جمشید نے ایک خنجر اس سے لے لیا — دونوں ایک دوسرے سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے — پہلا وار جیرال نے کیا۔ اس کا ہاتھ ایک دم سر سے اونچا اٹھا تھا — پھر انسپکٹر جمشید کے چہرے کی طرف بڑھا — انھوں نے پھرتی سے اپنے دائیں ہاتھ پر وار روکا اور جھکائی دے کر الگ ہو گئے۔

"میں ایک وار کر چکا — اب تمھاری باری ہے۔" اس نے کہا۔

"پہلے تم ہی وار کر لو۔" انسپکٹر جمشید نے اسے دعوت دی۔

"نہیں، یہ اصول کے خلاف ہے۔"

"اچھا تو وار سنبھالو۔" انھوں نے ترچھا ہاتھ مارا — نشانہ جیرال کے پیٹ کا لیا تھا — جیرال اچھل کر پیچھے ہٹ گیا — ساتھ ہی اس نے ان کے شانے پر وار کیا — وہ تیزی سے مڑے اور بائیں ہاتھ سے اس کا خنجر والا ہاتھ کلائی پر سے پکڑ لیا — پھر خود اس کے سینے پر وار کیا — جیرال نے بھی ان کی کلائی تھام لی — اب دونوں خنجروں والے ہاتھوں پر زور صرف کرنے لگے — دونوں کی کوشش یہی تھی کہ ان کا خنجر دشمن کی شہ رگ میں اتر جائے، لیکن خنجر تھے کہ گردنوں تک پہنچ ہی نہیں رہے تھے — کئی سیکنڈ تک زور آزمائی

ہوتی رہی — آخر جیرال بولا:

"میرا خیال ہے، ہم اس طرح کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"کیوں نہ دست بدست لڑائی لڑ کر فیصلہ کر لیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

دونوں نے خنجر دور پھینک دیے اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے — اب وہ اپنے مکوں اور لاتوں کو استعمال کر رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے ایک زبردست مکا تان کر اس کی ناک پر مارا — وہ پیچھے جھک گیا اور مکا اس کے سر پر لگا — ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کی کمر پر ایک زبردست ہاتھ جما دیا۔ وہ بھی تیزی سے مڑے اور اس کے پیٹ میں سر سے ٹکر ماری — جیرال لڑکھڑا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے قدم لڑکھڑائے تھے — لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔ اب پھر دونوں چٹانوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ویسے میرے دوست، کیا یہ مقابلہ انصاف سے خالی نہیں۔" اچانک انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب؟" جیرال چونکا۔

"مطلب یہ کہ میرے اور میرے ساتھیوں کے سروں پر مشین گنیں چمک رہی ہیں، جب کہ تم اس لحاظ سے آزاد ہو۔"

"میں نے بھی اس پر اعتراض کیا تھا، مگر میرا دوست ماسٹر نہیں مانا،

اس نے کہا تھا کہ اس طرح تم مقابلے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

"خیر کوئی بات نہیں، آؤ — ہو جائیں دو دو ہاتھ۔" انسپکٹر جمشید نے لاپروائی سے کہا۔

وہ پھر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ اس مرتبہ دونوں ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ لڑائی طویل ہوتی جا رہی تھی اور دیکھنے والوں کی بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لڑائی کبھی ختم نہیں ہوگی، یہ یونہی جاری رہے گی اور وہ کھڑے کھڑے ختم ہو جائیں گے۔

اچانک جیرال کا ایک مکا انسپکٹر جمشید کے سر پر لگا۔ اُن کا سر بُری طرح چکرایا، وہ لڑکھڑائے۔ جیرال نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ان پر چھلانگ لگا دی — دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید اس کے نیچے دبے پڑے تھے — فوراً ہی جیرال نے دونوں ہاتھ ان کے گلے پر دبا دیے۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور اکرام کو اپنے سانس سینوں میں اٹکتے محسوس ہوئے — ان کے حلق خشک ہو گئے۔

"انسپکٹر جمشید، آخر تم پھنس ہی گئے، تمہاری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی تھی، پھر بھی مجھے اقرار ہے کہ تم بہادر شخص ہو۔ تم نے ان حالات میں بھی جس دلیری سے مقابلہ کیا، اس کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔"

انسپکٹر جمشید کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ انھیں اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ پیشانی کی رگیں تن گئی تھیں۔ وہ کچھ اس طرح اچانک

گر رہے تھے کو سنبھل نہیں سکے تھے، ورنہ جیرال انھیں اتنی آسانی سے نہیں دبوچ سکتا تھا۔

"مجھے حیرت ہے، انسپکٹر! آخر تم اپنے ہاتھ پیر کیوں استعمال نہیں کر رہے ہو — آرام سے لیٹے ہوئے اپنا گلا کیوں گھٹوا رہے ہو۔" جیرال نے ہنس کر کہا۔

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید عجیب سے انداز میں مسکرائے اور بولے:

"میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم اس طرح گلا گھونٹ کر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔"

"کیا مطلب؟" جیرال نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں بہت دیر تک اپنا سانس روک سکتا ہوں — تم کچھ دیر اور زور لگا لو — جب دیکھوں گا کہ تم ناکام ہو چکے ہو اور تمھارا بس نہیں چل رہا ہے تو پھر اپنے ہاتھ اور پیر استعمال کروں گا۔"

یہ سن کر جیرال ہکا بکا رہ گیا — شاید یہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ حیران کن لمحہ تھا — ابھی وہ حیران ہی تھا کہ اچانک اس کی گردن پر انسپکٹر جمشید کے ہاتھ کی ہڈی اس زور سے لگی کہ وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ ان کی گردن سے اس کے ہاتھ خود بخود الگ ہو گئے تھے۔

فوراً ہی انسپکٹر جمشید اٹھ کر کھڑے ہو گئے مگر جیرال نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور ایک بار پھر وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

"جیرال، تم لڑائی کو طول کیوں دے رہے ہو، اسے جلدی سے ختم کیوں نہیں کر دیتے۔" ماسٹر نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

"تمھارا کیا خیال ہے ماسٹر، کیا میں انسپکٹر جمشید سے کھیل کھیل رہا ہوں — یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں — اگر میں بین الاقوامی جاسوس ہوں تو ان کی شہرت بھی نہ جانے کتنے ملکوں میں ہے۔ ان سے مقابلہ کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں، لوہے کے چنے چبانا ہے — میری جگہ اس وقت کوئی اور ہوتا تو کب کا شکست کھا چکا ہوتا۔"

"کیا تم انسپکٹر جمشید کے مقابلے میں دل ہار بیٹھے ہو؟" ماسٹر نے پوچھا۔ اس کی آواز میں ناگواری کی جھلک تھی۔

"نہیں خیر، یہ بات تو نہیں — میں ان سے مقابلہ کروں گا اور انھیں شکست دوں گا — یہ مجھے شکست نہیں دے سکتے، البتہ میں اتنا جان چکا ہوں کہ گلا گھونٹ کر میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"اچھا خدا کے لیے اب اس مصیبت کو ختم کر دو، انسپکٹر جمشید کا جلد از جلد صفایا کرو۔ ہمیں ابھی واپس بھی جانا ہے۔" ماسٹر نے کہا۔

"بہت بہتر — ابھی لو۔" اس نے کہا اور پھر انسپکٹر جمشید سے بولا:

"تم نے سن لیا انسپکٹر جمشید، میرے ساتھی کس قدر بے چین ہیں۔ انھوں نے مجھے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے پچیس لاکھ روپے دیے ہیں — یہ بھی اپنی جگہ سچے ہیں — پچیس لاکھ انھوں نے کھیل دیکھنے کے تو دیے نہیں — اس لیے آؤ ہم سنجیدگی سے فیصلہ کر لیں۔"

"تو کیا تم ابھی تک غیر سنجیدگی سے لڑتے رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"اور نہیں تو کیا میں تم سے لڑ رہا تھا — لڑائی تو دراصل اب شروع ہوگی۔" جیرال نے ہنس کر کہا۔

"بہت خوب، اگر یہ بات ہے تو آؤ — میں تمہاری اصل لڑائی بھی دیکھ لوں۔"

انھوں نے ایک دوسرے پر چھلانگ لگائی — اس مرتبہ ان کے جسم بجلی کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ دیکھنے والے دم بخود ہو کر یہ خوفناک جنگ دیکھ رہے تھے — انسپکٹر جمشید نے پوری قوت سے ایک مکا جیرال کی ناک پر مارا — جیرال نیچے جھک گیا اور جواب میں انسپکٹر کے پیٹ میں مکا مارا لیکن دونوں کے وار خالی گئے۔ انسپکٹر جمشید نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور جیرال کے سر کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا مارنا چاہا، لیکن یہ کیا ...... اس کے بال تو ان کے ہاتھ میں آگئے تھے — جیرال تو بالکل گنجا تھا۔ اس نے سر پر مصنوعی بالوں کی وگ لگا رکھی تھی۔

"دھت تیرے کی —" انسپکٹر جمشید نے کہا اور وگ کو زمین پر پٹخ دیا۔ ساتھ ہی جیرال کا ایک ہاتھ ان کے کندھے سے ٹکرایا — انھیں یوں محسوس ہوا، جیسے ان کا کندھا جسم سے الگ ہو گیا ہو۔ وہ جھلا گئے اور دوسری ایک ٹکر جیرال کی ٹھوڑی پر دے ماری — جیرال کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹھوڑی پکڑ لی۔

چند لمحوں تک دونوں کھڑے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر ایک دم ایک دوسرے کی طرف دوڑے، اور دونوں کے جسم اس زور سے ٹکرائے کہ کمرہ گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں دوسری طرف الٹ گئے۔

لیٹے لیٹے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے سوچ رہے ہوں، اب کیا کریں۔ کس رخ سے حملہ کریں — آخر انسپکٹر جمشید تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جیرال کو دبوچنے کے لیے آگے جھپٹے — جیرال نے قلابازیاں کھا کر خود کو ان سے بچایا اور پھر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

لڑائی طول پکڑ گئی تھی۔ کسی طرح فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ دیکھنے والے انھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے، نہ جانے اس لڑائی کا کیا انجام ہوگا — انھوں نے اپنی زندگی میں شاید اس قدر خوفناک جنگ نہیں دیکھی تھی۔

وہ پھر ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرنے لگے۔ ابھی تک دونوں میں سے کسی کے چہرے پر تھکنے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دونوں مزاج کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے لڑ رہے تھے۔ دیکھنے والوں کی بے چینی کا اب عالم ہی اور تھا۔ وہ پلکیں تک نہیں جھپکا رہے تھے۔ انھیں یوں لگ رہا تھا، جیسے یہ لڑائی کبھی ختم نہیں ہوگی، وہ اس لڑائی کو دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہو جائیں گے — کھڑے کھڑے ختم ہو جائیں گے اور لڑائی پھر بھی جاری رہے گی۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا اور کیسے ہوا — انھوں نے صرف اتنا دیکھا

کہ انسپکٹر جمشید بلا کی پھرتی سے نیچے جھکے تھے اور پھر ان سب کو جیرال اُن کے دونوں ہاتھوں پر نظر آیا۔ ان کے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور وہ تیزی سے گھوم رہے تھے۔ پھر انہوں نے جیرال کو چھوڑ دیا۔ وہ چکر کھاتا ہوا ایک درخت سے جا ٹکرایا۔

جیرال کی چیخ بہت بھیانک تھی — جزیرے کی پُرسکون فضا میں پھیلتی چلی گئی۔

* * *

انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انسپکٹر جمشید کو دیکھا۔ وہ اب بھی ایک چٹان کی مانند کھڑے تھے اور جیرال کو دیکھے جا رہے تھے — شاید اس خیال سے کہ ابھی پھر اٹھے گا اور ایک بار پھر ان کے مقابل آ کھڑا ہو گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی — آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"لو ماسٹر، سنبھالو اپنے جیرال کو — ہم چلتے ہیں۔"

"بہت خوب، انسپکٹر جمشید تم نے کمال کر دیا۔" ماسٹر کے منہ سے نکلا۔

اچانک وہ سب چونک اٹھے۔ جیرال کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا — آخر بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے گھسٹ کر اس درخت سے ٹیک لگا لی جس سے ٹکرایا تھا۔

اس کے چہرے پر اس عالم میں بھی ایک مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ شکست خوردہ سی تھی۔ اس نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا:

"تمہیں مبارک ہو انسپکٹر، تم جیت گئے اور میں ہار گیا — یہ میری زندگی کی پہلی شکست ہے — میں نے آج سے پہلے کبھی کسی سے شکست نہیں کھائی تھی، لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے کیونکہ دو بہادر جب لڑتے ہیں تو ان میں سے ایک ہارا ہی کرتا ہے — ویسے میں تمہارے اس کمال کی داد دیتا ہوں — تم نے مجھے بالکل ایک کھلونے کی مانند اٹھا لیا تھا — شاید میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے جیرال۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔"

"بہادر دشمن جب شکست کھاتا ہے تو جیتنے والے کو خوشی کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا کرتا ہے۔"

"اب تم آزاد ہو انسپکٹر — تمہارے بچے بھی آزاد ہیں، تم لوگ جا سکتے ہو — ہمارا یہ منصوبہ ناکام رہا۔ میرے پچیس لاکھ بھی گئے۔"

"اچھا دوست — اگر زندگی رہی تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی مقام پر تم سے پھر ملاقات ہو گی۔" انہوں نے کہا اور اکرام، محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرف مڑے۔

"آؤ بھئی چلیں — اچھا ماسٹر خدا حافظ۔"

"ٹھہرو انسپکٹر جمشید۔" ماسٹر کے منہ سے نکلا۔ اس کے لہجے میں

نہ جانے کیا تھا کہ انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔

جونہی وہ ماسٹر کی طرف مڑے، دھک سے رہ گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا پستول چمک رہا تھا۔

"تم اتنی آسانی سے نہیں جا سکتے" اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"مطلب یہ کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم جیرال کو شکست دے دو گے۔ ہم نے تو یہی سوچا تھا کہ تم اس کے ہاتھوں مارے جاؤ گے یہی ہمارا مقصد بھی تھا — اب جب کہ جیرال شکست کھا چکا ہے، ہم تمہیں کیسے جانے دیں — اس منصوبے پر ہم نے نہ جانے کتنا روپیہ خرچ کیا ہے — آبدوز کرائے پر لی — یہاں تک آنے پر اخراجات کیے — معلومات حاصل کیں — کار کرائے پر لی — ان حالات میں بھلا ہم تمہیں کیسے جانے دے سکتے ہیں — ہمیں تو تمہاری لاش کی ضرورت ہے" ماسٹر کہتا چلا گیا۔

"ماسٹر! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" جیرال نے حیرت زدہ لہجے میں کہا، "یہ اصول کے خلاف ہے۔"

"تم خاموش رہو جیرال — تمہاری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے، اب تم بے کار ہو چکے ہو" ماسٹر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"کچھ بھی ہو — میں یہ بے قاعدگی برداشت نہیں کر سکتا۔ انسپکٹر

جمشید نے مجھ پر فتح پائی ہے، اسے جانے دیا جائے" اس نے گرج کر کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا" ماسٹر نے بھی چلا کر کہا — "جارج اس کی جیب میں سے پستول نکال لو۔"

جارج نے آگے بڑھ کر جیرال کی جیب میں سے پستول نکال لیا — ماسٹر نے یہ دیکھ کر کہا:

"بس، اب منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا، ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جائے گی۔"

"تم پچھتاؤ گے ماسٹر، جمشید اگر میرے ہاتھ نہیں آیا تو تم بھی اس پر قابو نہیں پا سکو گے۔"

"یہ ہمارا اور انسپکٹر کا معاملہ ہے، تم چپ رہو — جارج، اگر اب یہ بولنے کی کوشش کرے تو اس کے سر پر پستول کا دستہ دے مارنا" ماسٹر نے جارج کو حکم دیا۔

"بہت اچھا جناب" اس نے کہا اور جا کر جیرال کے سر پر کھڑا ہو گیا۔

جیرال نے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"ہاں تو انسپکٹر جمشید، اب تم اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو — اور تم بھی" اس نے اکرام اور بچوں سے کہا۔

ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

بوڑھے کی آمد

ماسٹر، اگر میں زندہ رہا اور تندرست ہو گیا تو تم سے اس بدتمیزی کا انتقام ضرور لوں گا۔" جیرال بولے بغیر نہ رہ سکا۔

جارج نے جب یہ دیکھا کہ وہ بولے بغیر نہیں رہ سکتا تو پستول کا دستہ اس کے سر پر دے مارا — انھوں نے دیکھا جیرال ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا تھا اور زمین پر گر گیا تھا۔

"تم نے بہت اچھا کیا جارج، یہ یوں خاموش رہنے والا نہیں تھا۔" ماسٹر نے کہا، پھر اپنے دونوں ساتھیوں سے بولا:

"اب ان لوگوں کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"ہم ان کے ساحل سے بہت دور ہیں — فائر کی آوازیں شاید ہی ساحل تک جا سکیں گی۔ اس لیے ان کو ختم کرنا ہی مناسب رہے گا۔" ایک غیر ملکی نے مشورہ دیا۔

"ہارڈی ٹھیک کہتا ہے۔" تیسرا بولا۔

"جارج، تم کیا کہتے ہو؟" اس نے جارج سے پوچھا۔

"اب یہ لوگ ہمارے ہتھے چڑھ ہی گئے ہیں تو پھر انھیں چھوڑا کیوں جائے — زندہ رہنے کی صورت میں اور بھی خطرات ہیں۔

اس لیے ختم کرنا ہی مناسب رہے گا۔" جارج بولا۔

"میرا ووٹ بھی تمہاری طرف ہی ہے — اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم چاروں کی ایک ہی رائے ہے اور وہ یہ کہ دشمنوں کو زندہ نہ چھوڑا جائے، ویسے بھی ان کی وجہ سے ہمارے ملک کے بہت سے جاسوس گرفتار ہوئے ہیں اور ہمیں زبردست نقصان پہنچا ہے — اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیرال کا کیا کیا جائے۔" ماسٹر نے یہ کہہ کر اپنے تینوں ساتھیوں کو دیکھا۔

"گرنگری سے پوچھو، یہ زیادہ صحیح مشورہ دے گا۔" جارج نے چوتھے آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میرا تو خیال ہے، جیرال کو ہم زندہ چھوڑ جائیں اور جاتے ہوئے ایک سٹین گن بھی اس کے ہاتھوں میں چھوڑ جائیں تاکہ جب انسپکٹر جمشید اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کرتے ہوئے پولیس یا محکمہ سراغرسانی کے لوگ یہاں پہنچیں تو یہی خیال کیا جائے کہ جیرال نے ان سب کو مار ڈالا۔"

"بہت خوب، بہت اچھی ترکیب ہے — جواب نہیں۔" ماسٹر نے خوشی کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے — اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"ماسٹر، مجھے افسوس ہے، تم اپنے اس پلان پر عمل نہیں کر سکو گے۔" اچانک انھیں انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی —

وہ چونک اٹھے۔ انھوں نے دیکھا، ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر انسپکٹر جمشید نے اپنا پستول جیب سے نکال لیا تھا — شاید درختوں پر

موجود شین گنوں والے بھی ان کی طرف سے بے فکر تھے۔ ان کا خیال ہوگا کہ چار شین گنوں اور ایک پستول کی موجودگی میں انسپکٹر جمشید پستول نکالنے کی جرأت نہیں کریں گے — لیکن وہ تو میدان کے بیچوں بیچ پستول تانے کھڑے تھے اور ان کے پستول کا رُخ ماسٹر کی طرف تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" ماسٹر نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ "بھلا تم ایک پستول سے کیا کر سکو گے؟"

"تم مجھے نہیں جانتے ماسٹر، لیکن جیرال مجھ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے بہادری کا ثبوت دیا اور میں نے بھی اس سے کوئی دھوکا یا چالاکی کرنے کی کوشش نہیں کی، اب تم نے دھوکا دیا ہے تو میں نے بھی دھوکے سے یہ پستول نکال لیا ہے — باقی رہی یہ بات کہ میں ایک پستول سے کیا کر سکتا ہوں، اس کا نمونہ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ ایک پیر پر تیزی سے گھوم گئے۔ ساتھ ہی ان کے پستول سے چار گولیاں نکلیں — چکر پورا کرتے ہی پانچویں گولی ماسٹر کے ہاتھ پر لگی — اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر دور جا گرا۔ فوراً ہی فضا چیخوں سے لرز اٹھی — درختوں پر سے مشین گنوں والے دھم دھم کر کے گرنے لگے — وہ چاروں اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور یہ سب کچھ صرف ایک سیکنڈ کے اندر اندر ہو گیا۔

ماسٹر اور اس کے ساتھیوں کے ہوش اڑ گئے — انھوں نے ایسا منظر شاید اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ماسٹر کے ہاتھ سے خون

ٹپ ٹپ گرنے لگا لیکن کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی — بتوں کی مانند کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

"اکرام، ان کی شین گنیں اور پستول سمیٹ کر ایک طرف ڈھیر کر دو اور انھیں باندھ لو۔"

"بہت بہتر جناب۔" اکرام نے خوش ہو کر کہا — اس کے چہرے پر زندگی دوڑ گئی تھی۔

اس نے جلدی جلدی شین گنوں اور پستول کو اکٹھا کیا اور انسپکٹر جمشید کے نزدیک ایک درخت کے نیچے رکھ دیا — پھر جیب سے ریشم کی ڈوری نکال کر انھیں باندھنے لگا۔

"اگر کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو گولی اس کے سر کے پار ہوگی۔" انسپکٹر جمشید نے انھیں دھمکی دی — لیکن شاید ان میں سے کسی میں حرکت کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ صرف چند منٹ میں اکرام نے انھیں باندھ ڈالا — اس نے نہ صرف ان کے ہاتھ پشت کی طرف باندھے تھے بلکہ ان کے پیر بھی باندھ دیے تھے — انسپکٹر جمشید نے پستول جیب میں رکھ لیا۔

"اب تم جا کر موٹر بوٹ والے بوڑھے کو بلا لاؤ تاکہ ہم اس کی مدد سے یہ سارا سامان موٹر بوٹ پر سوار کرا سکیں۔" انھوں نے ماسٹر، اس کے ساتھیوں اور اسلحے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بہت بہتر جناب۔" اکرام نے کہا اور ساحل کی طرف چلنے کے لیے قدم اٹھاتے ہی تھے کہ آواز آئی:

"میں آگیا ہوں ـــــ اور کافی دیر سے یہ سارا کھیل دیکھ رہا ہوں۔"
انہوں نے مڑ کر دیکھا ـــ بوڑھا ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا ـــ یہ دیکھ کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ اس کے ہاتھ میں بھی ایک پستول تھا ـ

* * *

وہ اس کے ہاتھ میں پکڑے پستول کا مطلب نہ سمجھ سکے ۔ نہ صرف انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی بلکہ ماسٹر اور اس کے ساتھی بھی بوڑھے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے ـــ اتنی دیر میں وہ نزدیک آچکا تھا ـــ اس نے کہا :
"میں پہلے ہی جانتا تھا، نالائق گدھو ـــ کہ تم اسے گرفتار نہیں کر سکو گے۔"
"کیا مطلب ؟ کون ہو تم ؟" ماسٹر نے چنگھاڑ کر کہا ـ
"الو کے پٹھے، میں ہوں تمہارا باپ۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی بوڑھے نے اپنی ڈاڑھی اتار پھینکی ـــ اب ان کے سامنے ایک نوجوان آدمی کھڑا تھا ـــ جس کی نیلی آنکھیں انہیں گھور رہی تھیں ۔ اس پر نظر پڑتے ہی ماسٹر اور اس کے ساتھی تھر تھر کانپنے لگے ۔ انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں بھی حیرت تھی ـ

"آ ..... آپ ..... آپ ....." ماسٹر ہکلایا ـ
"ہاں، گدھے ۔ یہ میں ہوں ۔ اس منصوبے کی منظوری دیتے وقت بھی میں نے تم سے کہا تھا، تم کامیاب نہیں ہو سکو گے، مگر تم نہ مانے ۔ تم نے کہا، جیرال کا بنایا ہوا منصوبہ ناکام نہیں ہو سکتا ـــ اب دیکھ لو، وہ پڑا ہے جیرال ـــ اور تم اپنے چار ساتھی بھی گنوا بیٹھے ـــ میں نہ آ جاتا تو تمہارا حشر بھی برا ہوتا ۔"
وہ سب غیر ملکی تھے مگر انہیں صاف اردو بولتے دیکھ کر انہیں حیرت ہو رہی تھی ـــ اچانک انسپکٹر جمشید چونک اٹھے ـــ فرزانہ جس درخت کے پاس کھڑی تھی، اسی پر چڑھ رہی تھی ـــ اس طرح کہ وہ درخت کے دوسری طرف ہو گئی تھی ـــ انہوں نے ایک دم نظریں ادھر سے ہٹا لیں کہ کہیں نئے آنے والے کی نظر نہ پڑ جائے ۔
"میرے آقا، ہمیں معاف کر دیں۔" ماسٹر نے روتی صورت بناتے ہوئے کہا ـ
"یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا ـــ پہلے تمہیں کھول تو دوں ـــ لیکن نہیں، یہ کام تو میں انسپکٹر جمشید سے بھی لے سکتا ہوں ـــ انسپکٹر، مجھ سے ملو ـــ میں ہوں اپنے ملک کے محکمہ سراغرسانی کا سربراہ ـــ مجھے ڈاکٹر فاران کہتے ہیں ـــ اب مہربانی فرما کر میرے ساتھیوں کو کھول دو۔"
"لیکن تمہیں موٹر بوٹ کہاں سے مل گئی ؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا ـ

"میں نے پورے دن کے لیے کرائے پر لے رکھی ہے۔ ضمانت کے طور پر غیر ملکی نوٹوں کا ایک سوٹ کیس رکھوایا ہے — فکر نہ کرو، ایسے کام ہم کرتے رہتے ہیں — جیرال نے بھی تو کار حاصل کر لی تھی — وہ بھی کرائے کی تھی۔"

"بہت خوب، تو ان کے ساتھ تم بھی آئے تھے۔"

"ہاں، میں جانتا تھا، تم ان پر چھا جاؤ گے — میں تمہارے کام کرنے کے طریقوں سے واقف ہوں — چلو، اب میرے ساتھیوں کو کھول دو۔"

مجبور ہو کر انسپکٹر جمشید اور اکرام نے اُس کے ساتھیوں کو کھول دیا۔ اچانک ڈاکٹر فاران چونکا:

"ارے، وہ لڑکی کہاں گئی؟"

سب نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا، لیکن فرزانہ انہیں کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ صرف انسپکٹر جمشید، محمود اور فاروق کو معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے —

"کون سی لڑکی؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تمہاری بیٹی، ابھی ابھی تو یہیں تھی — اوہ، ماسٹر جزیرے کا چپہ چپہ چھان مارو — وہ جہاں بھی نظر آئے اُسے پکڑ لاؤ، کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر بیٹھے — دیکھو، ان لوگوں کو میں اپنے ملک میں زندہ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"جی — جی بہت اچھا —" ماسٹر نے کہا اور اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ دوڑتا چلا گیا۔

"کیا وہ لڑکی تیرنا جانتی ہے؟" ڈاکٹر فاران نے پوچھا۔

"ہاں، بہترین تیراک ہے۔"

"تب تو شاید وہ سمندر میں کود بھی گئی ہو — افسوس، میں اپنے آدمیوں پر برسنے کے شوق میں مار کھا گیا۔"

"تم اپنے آدمیوں کو فضول ہی گدھا اور اُلو کا پٹھا کہہ رہے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بکواس مت۔"

"ابا جان، کیا ہم بھی فرزانہ کو ڈھونڈیں جا کر۔" فاروق نے اچانک سوال کیا۔

"بیٹا ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے لو۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ اس وقت تو حالات کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے۔"

"خبردار، تم اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرو گے۔" ڈاکٹر غرایا۔

"لیکن فرزانہ کو تو آپ نے منع نہیں کیا۔" محمود نے کہا۔

"مجھے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کب کھسک گئی — ویسے تم نے اسے کھسکتے دیکھا ہوگا۔" ڈاکٹر فاران نے کہا۔

"ہاں، دیکھا ہے۔ دیکھا کیوں نہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"جلدی بتاؤ، وہ کس طرف گئی ہے!"

"افسوس، میں نہیں بتا سکتا۔" فاروق بولا۔

"کیوں، بتا کیوں نہیں سکتے؟"

"اس کے لیے مجھے ابا جان سے اجازت لینا ہوگی۔ آپ اجازت دلوا دیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"اگر یہ بکواس ہے تو نہ سنیں — اپنے کان بند کر لیں — کیا خیال ہے محمود — تم میری بکواس سننا پسند کرو گے؟"

"بکواس کیوں ہوتی — تمہاری باتیں تو بہت ہی پیاری ہوتی ہیں — ارے، وہ رہی فرزانہ —"

جملہ کہتے کہتے وہ اچانک چلا اٹھا — ہاتھ سے ایک طرف اشارہ بھی کیا تھا — ڈاکٹر فاران چونک کر اس طرف مڑا — یہی موقع تھا کام کرنے کا — انسپکٹر جمشید نے اس پر چھلانگ لگا دی — دونوں دھڑام سے زمین پر آ رہے — ڈاکٹر کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا — گرتے گرتے ڈاکٹر فاران اکرام سے ٹکرایا، اکرام کا سر ایک درخت سے لگا اور وہ ہائے کر کے بیٹھ گیا — اسے چکر آ گیا تھا۔

"محمود، پستول اٹھا لو۔" انسپکٹر جمشید چلائے — اسی وقت ڈاکٹر فاران زمین سے اٹھ کر پستول کی طرف لپکا۔ محمود نے بھی اپنی جگہ سے دوڑ لگائی، مگر ڈاکٹر فاران اس سے پہلے پستول تک پہنچ چکا تھا — وہ تیزی سے اسے اٹھانے کے لیے جھکا مگر دوسرے ہی لمحے محمود کی ٹھوکر پستول پر پڑی — وہ

گھسٹتا ہوا فاروق کی طرف گیا۔ اس نے جھک کر اٹھانا چاہا لیکن ڈاکٹر فاران کی لات اس کی کمر پر لگی اور وہ اوندھے منہ گرا — اتنے میں انسپکٹر جمشید سنبھل چکے تھے، وہ ڈاکٹر فاران کے راستے میں آ گئے۔ چاروں بری طرح ہانپ رہے تھے۔

اچانک فاران نے جھکائی دی اور ایک طرف بھاگ نکلا۔ وہ بوکھلا اٹھے — اس کا رخ اس درخت کی طرف تھا جس کے نیچے اکرام نے اسلحہ دکھا تھا — ڈاکٹر فاران کے راستے میں اکرام سر پکڑے ابھی تک بیٹھا تھا۔

"اکرام ہوشیار۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔

اکرام نے چونک کر اوپر دیکھا — ڈاکٹر فاران طوفان کی طرح دوڑتا ہوا اس کے پاس سے گزرا — اکرام نے فوراً ٹانگ چلا دی — وہ منہ کے بل زمین پر گرا — اکرام نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کی کمر پر سوار ہو گیا، لیکن یہی اس کی غلطی تھی — دوسرے ہی لمحے وہ کئی فٹ اونچا اچھل گیا اور ایک بار پھر ایک درخت سے ٹکرایا — اس مرتبہ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا — ڈاکٹر فاران پھر اٹھا اور درخت کی طرف لپکا۔ اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید پستول اٹھا چکے تھے — مجبور ہو کر انہوں نے فائر ڈاکٹر فاران کی ٹانگوں میں جھونک مارا۔

اس کے حلق سے ایک ہولناک چیخ نکلی اور اسلحے سے چند گز دور وہ زمین پر تڑپنے لگا — اس عالم میں بھی اس نے اسلحہ اٹھانا چاہا — مگر وہ ابھی چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور

اس کے لیے گھسنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

فائر کی آواز پورے جزیرے میں گونج گئی تھی — فوراً ہی انھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی — ڈاکٹر فاران کے ساتھی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے واپس آ رہے تھے —

جزیرے سے واپسی

ماسٹر اور اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے وہاں آئے اور پھر ڈاکٹر فاران کو تڑپتے دیکھ کر بھونچکے رہ گئے — ڈاکٹر فاران ابھی تک اسلحے کو پکڑنے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا —

"یہ کیا ہوا؟" ماسٹر کے منہ سے نکلا —

"کیوں، کیا تمھاری نظر کمزور ہے — دیکھ نہیں رہے، تمھارا آقا پڑا تڑپ رہا ہے" فاروق نے کہا —

"اوہ، کیا تم نے انھیں گولی مار دی؟" اس نے بوکھلا کر کہا —

"صرف ٹانگوں پر — میرا خیال ہے، اس کی دائیں پنڈلی اڑ گئی ہے"

"اوہ" ان کے منہ سے نکلا —

"اب کیا ہو گا؟" ہارڈی نے پوچھا —

"وہی ہو گا، جو تم ہمارے ساتھ کرنا چاہتے تھے — جیسے تم ہمیں اپنے ملک کی سیر کرانا چاہتے تھے، اب ہم تمھیں اپنے ملک میں گھمائیں گے اور نئی نئی چیزیں کھلائیں گے — فکر نہ کرو، ہمارے ملک میں قابلِ دید مقامات بہت ہیں" فاروق کہہ رہا تھا —

"آخر یہ سب ہوا کیسے؟" ماسٹر اب تک حیرت زدہ تھا۔ "پستول

تو آقا کے ہاتھ میں تھا۔

"بس کیا بتاؤں، کبھی کبھی میری عقل خراب ہو جاتی ہے۔ الٹا سیدھا بول پڑتا ہوں۔ اچانک کہہ بیٹھا، ارے وہ رہی فرزانہ ــ بس یہ حضرت بھی ایک ہی اُلّو نکلے ــ فوراً پلٹ کر دیکھ لیا ــ اب ہم اتنے بے وقوف بھی نہیں تھے کہ یہ پلٹ کر دیکھتے اور ہم کھڑے ان کا منہ دیکھتے رہتے ــ بس چھلانگ لگا دی ان پر ــ انھوں نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی اور گرا ہوا پستول اٹھانا چاہا، ہم نے پستول کو فٹ بال کی گیند سمجھ لیا۔ جب وہ ان کے ہاتھ نہ لگا تو یہ حضرت اس درخت کی طرف بڑھے ــ وہ دیکھ رہے ہیں نا آپ، جہاں اب اکرام صاحب بیٹھے ہیں۔ سٹین گنوں پر، اس طرح جیسے یہ گدیلے ہوں ــ ہاں تو آپ کے آقا اس طرف بڑھے ــ اب اگر یہ وہاں سے سٹین گن اٹھا لیتے تو شاید ان کی جگہ ہم پڑے تڑپ رہے ہوتے، اس لیے مجبوراً ایک عدد گولی چلانا پڑی جس کے لیے ہم معافی چاہتے ہیں۔" فاروق نے اچھی بھلی تقریر جھاڑ دی۔

"اُف خدا، اب کیا ہوگا؟"

"ڈرتے کیوں ہو بھائی، وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔"

"حیرت تو یہ ہے کہ تمھاری بہن کہاں چلی گئی۔"

"وہ اگر غائب نہ ہوتی تو یہ سب کچھ کیسے ہوتا ــ اس کے غائب ہونے میں بھی بڑی برکت ہے ــ جب بھی غائب ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی کارنامہ ضرور انجام پا جاتا ہے ــ یوں وہ بہت بڑی جادوگرنی

بھی ہے ــ اگر تم آنکھیں بند کرو تو ابھی حاضر ہو جائے گی۔" فاروق مذاق اڑانے والے لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے فاروق، تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ اب ہمیں ان لوگوں کو بالکل مہلت نہیں دینی چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بہت بہتر ــ فرمائیے، اب ہم کیا کریں؟"

اکرام اور تم دونوں مل کر ان کے ہاتھ پشت کی طرف باندھ دو ــ پیر نہ باندھنا ــ تاکہ یہ اپنے پیروں پر چل کر موٹر بوٹ تک جا سکیں۔"

"لیکن ابا جان، اب موٹر بوٹ کون چلائے گا ــ بڑے میاں تو آقا میں تبدیل ہو چکے ہیں۔" فاروق نے سوال کیا اور سب ہنس پڑے۔

"وقتی طور پر میں بڑے میاں بن جاؤں گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ارے، تو کیا آپ کو موٹر بوٹ چلانا آتا ہے؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"بہت اچھی طرح ــ ابھی تم اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لوگے۔"

"پھر تو مزہ آ گیا۔"

انھوں نے ماسٹر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ پشت کی طرف کر کے باندھ دیے ــ ڈاکٹر فاداں کو بھی نہیں بخشا گیا ــ اگرچہ وہ زخمی ہو چکا تھا، لیکن اس کے ہاتھ بھی باندھ دیے گئے ــ انسپکٹر جمشید کی ہدایت پر اکرام نے اس کی ٹانگ کے زخم پر رومال لپیٹ دیے۔

"چلیے ان سب کو لے کر موٹر بوٹ میں لا دو اور ان کے پیر بھی باندھ

دو۔ اس کے بعد ہم ان لاشوں کو اٹھالیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
اشر اور اس کے ساتھیوں کو موٹر بوٹ پر لایا گیا۔ پھر انہیں لٹا کر ان کے پیر جکڑ دیے گئے۔ محمود نے اسی پر ہی بس نہیں کیا، ان سب کے گرد بھی رسی لپیٹ دی۔

"بنڈل تیار ہے۔" اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

وہ واپس جزیرے کے درمیان میں پہنچے۔ محمود نے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"فرزانہ، اب تم بھی نیچے آجاؤ۔ بس اب ہم یہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔"

فرزانہ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے چونک کر اس درخت کی طرف غور سے دیکھا اور پھر وہ دھک سے رہ گئے۔ وہاں فرزانہ نہیں تھی۔

"فرزانہ، تم کہاں ہو؟" انسپکٹر جمشید پوری قوت سے چلائے۔ پھر ان کی نظر اس درخت پر پڑی، جس کے پاس جیرال بے ہوش پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کی سٹی گم ہوگئی کہ جیرال بھی اب وہاں نہیں تھا۔

"اوہ۔ وہ فرزانہ کو لے گیا۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا پھر وہ ساحل کی اس سمت میں دوڑ پڑے جس طرف دشمنوں کی موٹر بوٹ کھڑی نظر آئی تھی۔

وہ سب بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ ان کے دل دھک دھک کر

رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر جیرال فرزانہ کو لے جانے میں کامیاب ہوگیا تو اس وقت تک کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ وہ بیگم جمشید کو کیا منہ دکھائیں گے۔ کس منہ سے انہیں بتائیں گے کہ وہ فرزانہ کو ساتھ نہیں لا سکے۔

دوڑتے دوڑتے ان کے سانس پھول گئے، لیکن ان کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔ آخر وہ ساحل پر پہنچ گئے۔ اچانک وہ سب پرسکون ہوگئے۔ فرزانہ ساحل پر کھڑی تھی اور ساحل پر جو موٹر بوٹ کھڑی تھی اب تیزی سے سمندر میں چلی جارہی تھی۔ لیکن ابھی موٹر بوٹ زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ اسے جیرال چلا رہا تھا۔

"جیرال، رک جاؤ، ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔" انسپکٹر جمشید پوری قوت سے چلائے۔

جیرال نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ انسپکٹر جمشید پستول تانے کھڑے تھے اور وہ ان کے نشانے کی زد میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر مسکرا کر بولا:

"انسپکٹر جمشید، تم بھی بہادر ہو اور میں بھی۔ میرا اور تمہارا مقابلہ کسی اور میدان میں بہت جلد ہوگا۔ ویسے اگر تم بزدلوں کی طرح مجھ پر وار کرنا ہی چاہتے ہو تو میں بھی رکوں گا نہیں، تم گولی چلانا چاہتے ہو، ضرور چلاؤ۔ بہادری کی روایات کو توڑنا چاہتے ہو، بڑی خوشی سے توڑ دو۔ میں رکنے والا نہیں۔"

انسپکٹر جمشید کی انگلی کا دباؤ پستول کے ٹریگر پر دبتا چلا گیا لیکن پھر اچانک انھوں نے انگلی ہٹا لی — ان کا پستول والا ہاتھ نیچے جھکتا چلا گیا۔

"میں جانتا تھا انسپکٹر جمشید، تم بہادر ہو — تم گولی نہیں چلا سکتے۔"

"لیکن یہ بھی سُن لو، تمھاری ذات سے اس وقت میرے ملک اور قوم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا — یہی وجہ ہے کہ میں تمھیں چھوڑ رہا ہوں — اگر ملک کی آن پر حرف بھی آیا ہوتا تو تم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ آئندہ بھی اگر تم یہاں آگئے اور میرے وطن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں تم پر فائر کرتے وقت یہ ہرگز نہیں سوچوں گا کہ میرا اقدام بہادری کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"شکریہ دوست، میں ایک بار پھر آؤں گا — اس وقت میرے سامنے کیا مقصد ہوگا — یہ میں اس وقت خود بھی نہیں جانتا — ہاں، اتنا ضرور کہوں گا، آج کے بعد میں ماسٹر کے ملک سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گا — ان کا کوئی کام نہیں کروں گا — انھوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے — اچھا خدا حافظ۔"

اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا — ان میں سے کسی کا ہاتھ اسے الوداع کہنے کے لیے نہ اٹھ سکا — کچھ بھی ہو، وہ ایک دشمن تھا۔ دشمن ملک کے اشارے پر ان کے مقابلے میں آ سکتا تھا۔ وہ کس طرح ہاتھ ہلا کر اسے رخصت کر سکتے تھے۔

موٹر بوٹ لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جیرال کا

ہاتھ ابھی تک ہلتے ہوئے دیکھ رہے تھے — اسی وقت اکرام نے کہا:

"کیا ہم اس کا تعاقب نہیں کر سکتے؟"

"نہیں، میں اسے گرفتار نہیں کرنا چاہتا۔" انسپکٹر جمشید بولے — یوں بھی اس کے پاس جو موٹر بوٹ ہے ......"

"اور وہ آبدوز بھی ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"یہ تمھیں کس نے بتایا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جیرال نے — جب وہ ہمیں اغوا کر کے لا رہا تھا۔"

"ارے ہاں، فرزانہ تم بتاؤ — تمھارے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا — ہم تو یہ سمجھے تھے کہ جیرال تمھیں اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔ اسی لیے تو ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس طرف بھاگے تھے۔" محمود بولا۔

"مجھے افسوس ہے ابا جان۔"

"کیا مطلب، تمھیں کس بات پر افسوس ہے؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"جب آپ لوگ ماسٹر اور اس کے ساتھیوں کو ساتھ لے کر جا رہے تھے تو میں آپ کو دیکھ رہی تھی — آپ نظروں سے اوجھل ہوئے تو میں مڑی اور اس وقت میں نے دیکھا، جیرال اٹھ کر بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے فوراً درخت پر سے چھلانگ لگا دی اور اس کے پیچھے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر اور بھی تیز دوڑنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے ہم ساحل پر پہنچ گئے — جب میں یہاں پہنچی تو وہ موٹر بوٹ

پر بیٹھ چکا تھا اور اسے سٹارٹ کر چکا تھا — میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور — ابا جان — آپ جانتے ہیں، اس نے کیا کہا تھا؟"

فرزانہ کہتے کہتے رک گئی — اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"کیا کہا تھا؟" انسپکٹر جمشید نے پرسکون آواز میں کہا۔

"اس نے کہا تھا، میں تم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں، جب تمہارے والد نے مجھے اٹھا کر پھینک مارا تھا تو میں سمجھا تھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، لیکن بعد میں جب مجھے ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا، ریڑھ کی ہڈی محفوظ ہے۔ اپنے والد سے میرا اسلام کہنا — زندگی رہی تو تم سے پھر ملاقات ہوگی اور اس مرتبہ میں بھی کسی کو ہاتھوں پر اٹھا کر پھینک مارنے کا گر سیکھ کر آؤں گا۔"

یہ کہہ کر فرزانہ خاموش ہو گئی — محمود نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا:

"لیکن تمہیں افسوس کس بات پر ہے؟"

"اس پر کہ میں جیرال کو پکڑ نہ سکی۔"

"شکر کرو — تم اس سے بھڑ نہیں گئیں۔ بھلا وہ تمہارے قابو میں آنے والا تھا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" فرزانہ نے بھی مسکرا کر کہا۔

سمندر میں موٹر بوٹ اب ایک دھبے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ انھوں نے سوچا، جیرال اب تک ان کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا ہوگا اور آخر وہ دھبہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"آؤ چلیں۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور وہ سب چونک کر مڑے۔ لاشوں کو ڈھونے، اسلحہ اور دوسرا سامان موٹر بوٹ تک پہنچانے میں انھیں ایک گھنٹہ لگ گیا — جب وہ گھر کے لیے روانہ ہوئے تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ ہنگامہ خیز یہ دن ڈھل رہا تھا اور وہ واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ جب سب لوگ موٹر بوٹ میں بیٹھ گئے تو انسپکٹر جمشید ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھے۔

اس وقت انھوں نے دیکھا، انسپکٹر جمشید بڑی چابک دستی سے موٹر بوٹ چلا رہے تھے۔

"امی جان گھر میں بہت پریشان ہوں گی۔" فرزانہ بولی۔

"وہاں صرف تمہاری امی جان ہی نہیں، اور بھی نہ جانے کتنے لوگ پریشان ہوں گے۔"

"جی، اور کون لوگ؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"تمہاری امی نے ہوش و حواس میں آنے کے بعد سب سے پہلے بیگم شیرازی کو حالات سنائے ہوں گے، پھر خان رحمان اور پروفیسر داؤد کو فون کیا ہوگا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی ہوگی۔ محکمہ سراغرسانی کے

آفیسروں کو خبردار کیا گیا ہوگا — سارے شہر میں ہمیں تلاش کیا جا رہا ہوگا۔" یہ بتاتے وقت انسپکٹر جمشید مسکراتے رہے۔

"اس کا مطلب ہے، ہمارے گھر میں تو اچھا خاصا میلا لگا ہوا ہوگا۔" فرزانہ نے کہا۔

"لیکن یہ میلا بہت غمگین ہوگا۔" فاروق بولا۔

"کوئی بات نہیں، جب ہم وہاں پہنچیں گے تو خوشی کا سیلاب آ جائے گا میلے میں۔" محمود نے ہنس کر کہا۔

"دیکھنا بھائی، کہیں ڈوب نہ جانا سیلاب میں۔" فاروق بول اٹھا۔

گھر آ گئے

اڑھائی بج چکے تھے — ابھی تک بچوں یا انسپکٹر جمشید کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ سب کے سب گھر کے صحن میں اداس اور چپ چاپ بیٹھے تھے، جیسے کبھی اس گھر میں کوئی قہقہہ گونجا ہی نہیں تھا۔ ہنسی مذاق کی کوئی بات کی ہی نہیں تھی۔ بیگم جمشید کی آنکھوں سے کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے، کبھی صرف پلکوں میں ہی اٹک کر رہ جاتے۔ شہناز بیگم اور بیگم شیرازی انہیں بار بار تسلی دے رہی تھیں۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی دلاسا دے رہے تھے۔

پولیس کا سب انسپکٹر تین مرتبہ آ چکا تھا۔ ہر مرتبہ اس نے یہ خبر سنائی تھی کہ پورے شہر میں شد و مد سے تلاش کی جا رہی ہے، لیکن ابھی تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ ابھی ابھی تیسری بار اطلاع دے کر گیا تھا کہ ایک بار پھر گھنٹی بجی۔ خان رحمان نے دروازہ کھولا۔ آنے والے ڈی آئی جی صاحب تھے۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی۔" خان رحمان بولے۔

"میں بہت فکرمند ہوں۔ صبح سے میں نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ نہ جانے بیگم جمشید کا کیا حال ہوگا، بس ان کے خیال سے آ گیا۔"

خان صاحب کہہ رہے تھے۔ ان کی آواز سن کر پروفیسر داؤد بھی آ گئے — انھوں نے خان صاحب سے ہاتھ ملایا۔ اچانک خان صاحب کی نظر دیوار کی طرف اٹھ گئی۔ ایک لمحے کو انھوں نے دیوار پر لکھے ہوئے نام کو بے خیالی میں پڑھا اور پھر زور سے اچھل پڑے۔

"کیا ہوا، خیریت تو ہے جناب؟"

"یہ — یہ — یہ نام — دیکھ رہے ہیں، دیوار پر لکھا ہوا؟"

"ہاں، کیوں کیا بات ہے اس نام میں؟" خان رحمان بولے۔

"یہ جیرال ہی لکھا ہے نا؟"

"جی ہاں!"

"اُف میرے خدا، تو کیا یہاں جیرال آیا تھا؟" ان کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"یہ جیرال کون ہے؟" پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر کہا۔

"ایک بین الاقوامی مجرم، جو بڑی بڑی حکومتوں کے لیے معاوضے پر کام کرتا ہے — اگر وہ بچوں کو اغوا کر کے لے گیا ہے تو پھر تینوں بچے شہر میں ہرگز نہیں ہو سکتے، جب کہ ہم اس وقت تک انھیں شہر میں تلاش کراتے رہے ہیں اور اگر انسپکٹر جمشید کی نظر اس نام پر پڑ چکی ہے تو پھر وہ بھی شہر میں موجود نہیں ہو سکتے — کیونکہ وہ جانتے ہیں، جیرال ہمیشہ سمندروں کے ذریعے سفر کرتا ہے۔"

"اوہ —" ان کے منہ سے نکلا۔

"افسوس، اگر صبح میں یہاں آ گیا ہوتا تو ہم سمندر میں جال ڈلوا دیتے، مگر جیرال تو اب نہ جانے کہاں کا کہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"اس سے تو پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمشید بھی اس کے پیچھے ہے۔"

"ہاں، خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔" خان صاحب بولے۔

"آمین۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"اچھا، یہ نئی بات بیگم جمشید کو نہ بتایئے گا — وہ اور فکرمند ہوں گی۔"

"آیئے، اندر چلتے ہیں۔"

وہ اندر آئے ہی تھے کہ ایک بار پھر گھنٹی بجی۔

* * *

ساحل پر پہنچ کر انھوں نے لاشیں اور قیدی پولیس کے حوالے کیے اور خود گھر کا رخ کیا — انھوں نے سوچا تھا کہ وہ باقی کام تو بعد میں بھی کر لیں گے — پہلے تو گھر پہنچ کر وہاں موجود پریشان لوگوں کو تسلی دینا چاہیے۔ ویسے انسپکٹر جمشید نے پولیس والوں کو ہدایت کر دی تھی کہ لاشوں اور قیدیوں کو فوراً محکمہ سراغرسانی کی عمارت میں پہنچا دیا جائے۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر انھوں نے دروازے کی گھنٹی بجائی — دروازہ فوراً ہی کھلا — وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دروازہ کھولنے

والے خان رحمان، پروفیسر داؤد اور ڈی آئی جی صاحب تھے۔

"ارے!" تینوں کے منہ سے انہیں دیکھتے ہی نکلا۔

"ہم خواب دیکھ رہے ہیں یا یہ واقعی تم ہو۔" خان صاحب بولے۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہم ہی ہیں — ویسے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم واپس نہ آتے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تم نہیں جانتے کہ ہم نے وقت کس طرح گزارا ہے — بس ایک ایک منٹ ہم پر بھاری گزرا ہے —" پروفیسر داؤد بولے۔

"اچھا، انہیں اندر تو آنے دو — پھر سارے حالات سنیں گے اطمینان سے بیٹھ کر۔" خان رحمان مسکرائے۔

جونہی وہ اندر آئے، سب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے دریا اُمڈ پڑے۔

"ارے، یہاں تو واقعی میلا لگا ہوا ہے۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"لیکن میلے کی رونق تو اب آئی ہے۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

"یا اللہ، تیرا شکر ہے۔" بیگم شیرازی بولیں۔

بیگم جمشید کے منہ سے تو خوشی کی وجہ سے کوئی لفظ نکل ہی نہ سکا۔ بس وہ انھیں اور بے اختیار محمود، فاروق اور فرزانہ سے لپٹ گئیں۔ پھر تجویز ٹھہری، اطمینان سے بیٹھ کر حالات سننے کی — صحن میں جگہ کم تھی۔ اس لیے سب لوگ ڈرائنگ روم میں اٹھ آئے۔

ابھی وہ اطمینان سے بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ دروازے کی گھنٹی

ایک بار پھر بجی —

"خدا خیر کرے — اب کون آ گیا۔" خان رحمان بولے اور دروازے کی طرف جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھئی ذرا احتیاط سے — کہیں کوئی نئی مصیبت نہ مول لے آنا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے، ویسے مفت ملے تو لیتا آؤں گا۔" خان رحمان نے مسکرا کر کہا۔

وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئے اور چٹخنی گرانے سے پہلے بولے:

"ہاں بھئی، کون ہے دروازے پر؟"

"جی، اخباری رپورٹر۔" باہر سے آواز آئی۔

"تو آپ اخباری نمائندے ہیں — لیکن آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ اخباری نمائندے ہیں۔"

"ثبوت کے طور پر ہمارے پاس اپنے کارڈ موجود ہیں۔"

"دیکھو بھائی، یہ گھر ابھی ابھی ایک بڑے حادثے سے بال بال بچا ہے، اس لیے اگر تم میرے دروازہ کھولنے سے پہلے کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟" باہر سے حیرت زدہ لہجے میں کہا گیا۔

"ممکن ہے یا نہیں ہے — یہ میں نہیں جانتا — ارے ہاں، تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ اپنے کارڈ دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دو۔"

"ہاں واقعی۔"

اور پھر کارڈ اندر آ گئے ۔۔۔ دوسری طرف خان رحمان کو واپس پہنچنے میں دیر ہوئی تو سب پریشان ہو گئے ۔ آخر انسپکٹر جمشید ہی دروازے پر آئے۔

"کیا بات ہے رحمان!" انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کارڈ دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب! کس کے کارڈ دیکھ رہے ہو؟"

"جو اندر آنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اپنے اپنے کارڈ دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دیں۔"

اور انسپکٹر جمشید ہنس پڑے ۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر جمشید نے ان سے معافی چاہی کہ دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی۔

"کوئی بات نہیں جناب، ہم کچھ کچھ حالات جان چکے ہیں، اس لیے یہ احتیاط بے معنی نہیں ہے۔"

"شکریہ، آئیے آپ بھی اندر ہی آ جائیے۔" انھوں نے کہا۔

اور وہ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"اب سنائیے سارے حالات۔" بیگم شیرازی بولیں۔

"شروع تو بیگم صاحبہ کریں گی ۔۔ کیونکہ کہانی ان سے شروع ہوئی تھی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

بیگم جمشید نے کہانی سنانا شروع کی۔ جب انھوں نے جیرال کو ناشتا دینے کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو ڈرائنگ روم قہقہوں سے

گونج اٹھا ۔۔ اس کے بعد کا حصہ محمود، فاروق اور فرزانہ نے سنایا کیونکہ پھر وہ آ گئے تھے ۔۔ کہانی کا آخری حصہ سب سے زیادہ دلچسپ تھا اور یہ تھا انسپکٹر جمشید کا جیرال سے مقابلہ کرنا ۔۔ سنتے وقت ان کے سانس رک رک گئے ۔ پھر جب انھوں نے بتایا کہ کس طرح جیرال کی شکست کے بعد ماسٹر نے پستول نکال لیا تو سب لوگ دنگ رہ گئے ۔ آخر میں موٹر بوٹ والے بوڑھے کے بارے میں جان کر تو ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

"اور یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" بیگم جمشید ان کے خاموش ہونے پر بولیں۔

"کیوں؟" کئی آوازیں ابھریں۔

"اگر میں ایک منٹ کی سستی نہ کرتی اور اسی وقت دروازہ بند کر لیتی تو جیرال اندر آ ہی نہ سکتا۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے ۔۔۔ وہ کسی نہ کسی طرح اندر ضرور آتا۔"

"لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیرال نے ہمیں اس وقت کیوں نہ پکڑ لیا، جب ہم سکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔" فرزانہ نے کہا۔

"اپنے پیچھے کوئی کہانی بھی تو چھوڑ کر جانا تھا نا ۔۔۔ دیوار پر جیرال لکھ کر تو گیا ہی تھا وہ ۔۔۔ بیگم کو بھی پریشان کر ڈالا تاکہ یہ بعد میں مجھے بتائیں تو میں اس کے پیچھے دوڑا جاؤں۔ یہ وہ جانتا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ یہ بھی کہ وہ ہمیشہ سمندر کے

ذریعے سفر کرتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا آپ کو جیرال کے فرار ہونے کا افسوس ہے؟" ایک اخباری نمائندے نے سوال کیا۔

"جی نہیں، وہ ایک بہادر دشمن ہے، میں اس کی عزت کرتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

اور اس طرح یہ مجلس برخاست ہوئی۔ دوسرے دن کے اخبارات ان کی کہانی سے بھرے پڑے تھے۔